

خانی خانے



سلمان باسط

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خاکی خاکے
سلمان باسط

خاکی خا کے

(معاصر ادیبوں کے شخصی خا کے)

سلمان باسط

استعارہ ، اسلام آباد

معیار ہمارا اعتماد آپ کا



۱۹۹۹ء

کتاب	:	خاکی خاکے
مصنف	:	سلمان باسط
سرورق و تزئین	:	روش ندیم
مطبع	:	رین پرنٹرز
قیمت	:	۱۰۰ روپے

امی جی
لبا جی
کے نام

تشکیل

11	سلمان باسط کی مرقع نگاری	*
25	جواز	*
29	اظہار الحق	○
35	انور مسعود	○
41	جلیل عالی	○
47	حمید شاہد	○
51	داؤد طاہر	○
55	رؤف امیر	○
63	عثمان خاور	○
69	غفور شاہ قاسم	○
	اظہار بھی مشکل ہے	○
	مجمع باز	○
	جناب عالی	○
	جادوگر	○
	گورداس پور کا پینڈو	○
	کالا چٹا پہاڑ	○
	بھائی جان	○
	میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں	○

75	فاخرہ بتول	آپی دھاپا	○
81	مبارک شاہ	شاہ جنات	○
87	مستنصر حسین تارڑ	گل باتیا	○
95	منشا یاد	حسب منشا	○
101	یعقوب آسی	عروضا	○
105	سلمان باسط	ڈھول کے پول	○

سلمان باسط کی مرقع نگاری

آپس کی بات ہے، سلمان باسط نے زندگی میں اگر کسی کام کی انجام دہی میں مستعدی دکھائی ہے تو وہ یہی ”خاکی خاکے“ کی اشاعت ہے ورنہ آپ کو انور شعور کا وہ شعر تو یاد ہوگا جو اس نے بطور خاص اسی کے لئے کہا تھا۔

تسابل ایک مشکل لفظ ہے اس لفظ کا مطلب

کتابوں میں کہاں دیکھوں کسی سے پوچھ لوں گا میں

ہر چند ہمارے دوستانہ تعلق کو خاصا عرصہ بیت چکا ہے لیکن پچھلے چند برسوں کے دوران قربت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ہم لازم و ملزوم ہو گئے۔ ویسے سلمان باسط نے زیر خاکہ تمام شخصیات کے لئے ہمارے دوست کے الفاظ بے دریغ استعمال کیے ہیں لیکن ہر ہاتھ ملانے والا، خاکہ لکھوانے والا اور حجامت بنوانے والا دوست نہیں ہوتا۔ ہم نے کئی بہاریں اور خزانیں ایک ساتھ گزاری ہیں۔ ہماری دوستی میں برف موسم کی سرد مہری اور اکتاہٹ بھی آئی ہے اور مہربان دھوپ کی حدت اور شدت بھی، مگر اب یوں ہے کہ سلمان میرے دل کی ضرورت ہو گیا ہے۔ اسی لئے میں نے ایک غزل بھی اس کے نام کی ہے۔

سنو سلمان، تم دل کی ضرورت ہو گئے ہو

قسم سے جان، تم دل کی ضرورت ہو گئے ہو

بہت عرصہ رہی ہے بے سبب سی ایک دوری

اور اب اک آن تم دل کی ضرورت ہو گئے ہو

جب میں پنڈی کا بھرا پرا میلہ چھوڑ کر واہ آ رہا تھا تو میرے پیش نظر صرف سلمان باسط کا چہرہ تھا۔ سادہ، معصوم، بھولا، محبت کی روشنی سے دکلتا ہوا، خوب صورت اور دلنشین چہرہ، محبوبیت جس پر بکھر بکھر جاتی ہے اور دوستی جس پر ناز کرتی ہے۔ اب ہماری جوڑی ادبی حلقوں میں مقبول ہو رہی ہے جیسے فلمی آسمان کے ستارے ریمبو اور صاحبہ، اگر یہ مثال صحیح ہے تو ”صاحبہ“ سلمان کو قرار دیا جائے گا کہ اس کے چہرے پر ”محبوبیت“ بکھر بکھر جاتی ہے اور مجھے ریمبو کہہ لیجئے کہ کتنی میری شناخت ہے۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ جیسے ریٹائرمنٹ سے قبل انور مسعود اور احسان اکبر کی مثال دی جاتی تھی۔ ویسے امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی کہہ لینے میں بھی حرج نہیں ہے اگرچہ ہم دونوں محض اسٹنٹ پروفیسر ہیں کسی ادارے کے سربراہ و براہ اور کسی ملک کے سفیر شفیق ہرگز نہیں۔

ہم نے اپنے تئیں ادب کی دنیا میں دھو میں مچائی ہوئی ہیں۔ حلقے کے ہفتہ وار اجلاس منعقد کرتے ہیں، شعر کہتے ہیں، تقریبات سجاتے ہیں، مضمون لکھتے ہیں، خاکے اڑاتے ہیں، کتابیں چھپواتے ہیں اور خود کو خاصی مشہور و معروف شخصیات میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سلمان باسط کو شکوہ ہے کہ کسی بڑے شہر میں نہ ہونے کے باعث ہمیں نقصان پہنچ رہا ہے۔ ریڈیو والے ہمیں نہیں پوچھتے، ٹی وی تو ہمیں منہ ہی نہیں لگاتا اور اخبارات ہماری خبریں تک گول کر جاتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ہم بڑے ادبی دھارے میں ہوتے تو ہمارے وارے نیارے ہوتے۔ میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی مثال دیتا ہوں کہ دیکھو انہوں نے انک میں بیٹھ کر کتنا کام کیا اور کیسا نام کمایا۔ پھر کتنا ہوں ظفر اقبال ساری زندگی اوکاڑے میں بیٹھا رہا لیکن اردو غزل اس کے گرد طواف کرتی رہی لیکن وہ نہیں مانتا اور ہر وقت بڑے شہروں کے لئے پر تو لے رکھتا ہے۔ اسے مضافاتی کہلانے میں عار ہے اور میں ٹھہرا سدا کا دیہاتی۔

”خاکا خاکے“ کا بڑا محرک واہ کینٹ کی ادبی تنظیم ”صریر خامہ“ کا وجود ہے یہ الگ بات کہ سلمان میں خاکہ نگاری کی صلاحیت بہت پہلے سے موجود تھی اور وہ اس کا اظہار برسوں پیشتر کر چکا تھا۔ اس نے ایم۔ اے کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ اور ہم جماعت دوستوں کا ایک اجتماعی خاکہ لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا تھا۔

اس کے بعد بھی اس نے ایک آدھ خاکہ لکھا لیکن واہ کینٹ میں اس کی خاکہ نگاری نے باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ واہ کینٹ اگرچہ چھوٹا شہر ہے لیکن بڑے ادیبوں سے کبھی محروم نہیں رہا۔ راز مراد آبادی، شاہد نصیر، نذیر احمد شیخ، سبط علی صبا وغیرہ تو گذر گئے لیکن ان کی روایت کے تسلسل کے طور پر علی مطاہر اشعر، عثمان ناعم، امان اللہ خان، عثمان خاور، تبسم رحمان، مشتاق آثم، عصمت حنیف اور امجد شہزاد وغیرہ موجود ہیں اور اپنے شب و روز شعر و ادب کی آبیاری کے لئے وقف کیے ہوئے ہیں۔ اس تنظیم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حلقے کے اراکین کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی احباب کی کتابوں کے خصوصی مطالعے کی تقریبات منعقد کرتی رہتی ہے۔ ان تقریبات میں سلمان باسط کے خاکے اور فقیر کے مضمون کا انتظار کیا جاتا ہے۔ سلمان باسط کے خاکے کے بارے میں تو میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اپنے متعلق میں نے دوسروں کی رائے کا احترام کیا ہے۔

سلمان باسط کے بیشتر خاکے ”صریر خامہ“ کے زیر اہتمام ہونے والی تقریبات میں پڑھے گئے۔ حلقے کے اراکین میں سید مبارک شاہ کی ”جنگل گمان کے“ رؤف امیر کی ”درنیم وا“ اور عثمان خاور کی ”ہریالیوں کے دیس میں“ جب کہ مہمان دوستوں میں محمد اظہار الحق کی ”پری زاد“ غفور شاہ قاسم کی ”پاکستانی ادب“ داؤد طاہر کی ”شوق ہم سفر میرا“ محمد حمید شاہد کی ”جنم جنم“ فاخرہ بتول کی ”چاند نے بادل اوڑھ لیا“ اور جلیل عالی کی ”شوق ستارہ“ کے حوالے سے سلمان باسط نے خاکے پڑھے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول ”راکھ“ کی پہلی تقریب ہم نے ہی واہ کینٹ میں منعقد کی تھی۔ سلمان نے اپنا معروف خاکہ ”گل باتیا“ اور میں نے مضمون بعنوان ”ناول راکھ میں تاریخ اور وقت کی جبریت“ پڑھا تھا۔ پچھلے دنوں ادیبوں کی کانفرنس کے موقع پر ہم دونوں کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر خواتین کے جھرمٹ میں سے تارڑ والہانہ انداز میں اٹھا اور آگے بڑھ کر ملا تو ہم نے اسے ”راکھ“ پر انعام ملنے کی مبارک باد دی۔ اس نے یہ کہہ کر ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا کہ ”یہ بوٹا آپ ہی دوستوں کا لگایا ہوا ہے“ یہ مستنصر حسین تارڑ کی اپنی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ جتنے معروف اور لینڈ کا درجہ حاصل کرنے والے ادیب کے لئے ایک مضافاتی شہر کی بے نام سی تقریب کیا

معنی رکھتی ہے؟

میں نے عرض کیا ہے کہ سلمان باسط کے خاکے کا ہمارے یہاں انتظار کیا جاتا ہے۔ جب اس کی باری آتی ہے حاضرین محفل کا تجسس دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، بات بات پہ ققمہ پڑتا ہے کیونکہ سلمان باسط کے جملے جملے سے فزاح جھلک جھلک جاتا ہے۔ جب تک وہ سٹیج پہ رہتا ہے ہنسی کے فوارے پھوٹتے رہتے ہیں، مسلسل تالیاں بجتی رہتی ہیں۔ اس کا خاکہ کسی تقریب کی کامرانی کا آئینہ دار ٹھہرتا ہے۔

اب جس کے متعلق خاکہ پڑھا جا رہا ہوتا ہے، وہ کیا سوچتا ہے؟ یہاں مختلف نوعیت کے رد عمل دیکھنے میں آئے مثلاً ایک دوست جو بہت روشن خیال اور ترقی پسند بنتے ہیں ناراض ہو گئے اور انہوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ سلمان باسط نے بھانڈوں اور میراٹیوں کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ بہت جلد لوگ اسے شادیوں پر بلانا شروع کر دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ہو سکتا ہے ایسا ہو بھی جاتا لیکن جب سے سلمان نے خاکہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا ہے حکومت نے ویلے پر پابندی لگا دی ہے اور سلمان کا کام تو دعوت کے بعد شروع ہونا تھا۔ غفور شاہ قاسم کا خاکہ سلمان نے میانوالی کی ایک تقریب میں جا سنایا تھا۔ سنا ہے جب سے اب تک غفور شاہ جدھر سے گذرتا ہے کالج کے لڑکے بالے ناک پر رومال رکھے اوئے اوئے کرتے ادھر ادھر تیزی سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ یہ تو تھا منفی رد عمل، مثبت پہلو یہ ہے کہ بعض لوگ فرمائشیں کر کر کے سلمان سے خاکہ لکھوانے کے درپے ہیں۔ اب اپنی فاخرہ بتول ہی کو لیجئے کہ اس کے خاکے کیلئے بہت سی سفارشیں آئیں، میں اور سلمان خاکے کے نکات جمع کرنے فاخرہ کے گھر گئے۔ فاخرہ نے کھانا لا کر سامنے رکھا، سلمان خاکے کی جزئیات میں کھویا رہا اور میں نے خوب خوب مزے اڑائے۔

محمد حمید شاہد کی تقریب میں جب سلمان باسط نے خاکہ پڑھا تو منشا یاد نے صدارتی کلمات میں ہم دونوں کے بارے میں یہ تاریخی جملہ کہا ”واہ کینٹ والے رؤف امیر اور سلمان باسط ہمیں دے دیں اور ہم سے درجن ڈیڑھ درجن ادیب لے لیں“ جب یہ جملہ اخبارات کی زینت بنا تو درجن ڈیڑھ درجن ادیبوں نے ہماری جو

درگت بنائی مت پوچھے، اصل میں تمام اسلام آبادیوں نے خود کو درجن ڈیڑھ درجن میں شامل کر لیا تھا۔

سلمان باسط کے خاکوں کی عمدہ ترین پذیرائی جلیل عالی کی تقریب میں ہوئی۔ افتخار عارف صدارت کر رہے تھے، جب وہ تقریر کے لئے اٹھے تو انہوں نے کہا ”میں نے قبل ازاں بھی سلمان کے بعض خاکے سنے ہیں اگر وہ اس میدان میں رہ گئے تو بچتے نظر نہیں آتے“ ماشاء اللہ سلمان نے اس میدان میں مضبوطی سے قدم جما لیے ہیں اور اسے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہے۔

یہ تمام خاکے ہمارے اپنے ماحول سے برآمد ہوئے ہیں۔ وہ شخصیات جو سلمان باسط کے زیر مطالعہ آئی ہیں ہمارے ارد گرد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں ملکی اور بین الاقوامی سطح کی شخصیات بھی ہیں، ادب کی دنیا کے نو واردان بھی ہیں اور مجھ ایسے گوشہ نشین بھی۔ جس شخص سے سلمان باسط کا کوئی تعلق بنتا ہے وہ اسی کو موضوع بناتا ہے (اور یہ خاکے کی بنیادی ضرورت بھی ہے) ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں روابط کی نوعیت گہری ہے اور کہیں سطحی، جیسے عثمان خاور سے تعلق کی گہرائی نے خاکے کی گیرائی میں اضافہ کیا ہے۔ ویسے حیران کن بات یہ ہے کہ خاکہ تحریر میں لاتے لمحے تک بعض افراد سے سلمان کی صرف ایک ملاقات ہے لیکن اس نے اپنی قوت مشاہدہ سے خاکے کو بھرپور بنا لیا ہے۔

سلمان باسط کے خاکوں کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ اس کے محض عنوان ہی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ وہ چند لفظوں میں مطلوبہ شخصیت کا پورا تاثر محفوظ کر دیتا ہے۔ اس سے وہ لوگ زیادہ محفوظ ہوتے ہیں جو شخصیت کو جانتے ہیں لہذا تجربے میں آیا ہے کہ جو نئی وہ عنوان پڑھتا ہے ایک توانا قسم کا قہقہہ فضا میں بلند ہوتا ہے۔ یہ قہقہہ اس بات کی تائید ہوتا ہے کہ لوگوں نے شخصیت کی تشہیم کر لی ہے۔ گویا اس کے ہر خاکے کا عنوان ایسی کلید ہے جس سے پیچ در پیچ شخصیت کے دروازے ایک ایک کر کے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ بولتا بہت ہے، کمپیرنگ بھی اس کا ایک میدان ہے لہذا سلمان باسط نے اسے ”گل باتیا“ کا نام دیا۔ محمد اظہار الحق کی شخصیت خاصی مشکل ہے اور ہر کس و ناکس پر آسانی سے نہیں کھلتی لہذا اس کے

خاکے کو ”ظہار بھی مشکل ہے“ کا عنوان دیا گیا۔ رؤف امیر کے بال آدھے سفید اور آدھے سیاہ ہیں، رنگ بھی ماشاء اللہ گہرا سانولا پایا ہے اور شخصیت میں پہاڑ جیسی ہٹ دھری ہے اس لئے ”کالا چٹا پہاڑ“ ٹھہرا۔ سلمان باسط کے پیٹ کا حدود اربعہ فلسفار ننھا کے مشابہ ہے اور کوئی بات ٹھہرتی نہیں ہے مزید یہ کہ خاکہ نگاری کا پیشہ اپنایا ہے لہذا ”ڈھول کے پول“ کھولے گئے۔ اپنے خاکوں کے عنوانات کی خفی و جلی معنویت کے لئے سلمان باسط پہلے ہی قدم پر تحسین کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

سلمان باسط نے کتاب کے نام میں چھوٹی اور بڑی یائے کے استعمال سے ایک اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے لیکن ”خاکے خاکے“ میں جہان معنی کی ایک دنیا آباد ہے۔ لگتا ہے سلمان باسط نے اپنے دست ہنر سے گھگھو گھوٹے بنائے ہیں اور ٹوکری سر پہ رکھے گلی گلی آواز لگائے پھرتا ہے۔ مجھے صرف اتنا اعتراض ہے کہ یہ خاکے ”خاکیوں“ کے ہیں تو ان میں مستنصر حسین تارڑ کا ”آبی“ محمد ظہار الحق کا ”آتش“ اور فارخہ بتول کا ”انوری“ خاکہ کیسے شامل ہو گیا! مزید یہ کہ یہ خاکے ”آومیوں“ کے ہیں تو اپنی پی آر شپ کے زور پہ ایک جن ان میں کیسے در آیا؟ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں مبارک شاہ کا حوالہ دے رہا ہوں۔

اگرچہ یہ تمام خاکے تقریبات میں پڑھے گئے ہیں اور انتہائی غلبت میں لکھے گئے ہیں لیکن خاکہ نگار نے فن کے معیار کو کہیں بھی متاثر نہیں ہونے دیا۔ میں اس موقع پر اردو خاکے کے ارتقاء کے حوالے سے طویل بحث چھیڑنے کے حق میں نہیں ہوں۔ مجھے رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں علی گڑھ کی مقامیت کا احساس بھی ہے۔ میری نظر میں احمد بشیر کے خاکوں کی بے باکی بھی کھلتی ہے۔ مجھے اس تنقیدی اصول کا علم بھی ہے کہ خاکہ نگار کا رویہ ہمدردانہ ہونا چاہئے اور یہ کہ خاکے میں شخصیت کے خارجی و داخلی تضادات نمایاں ہونے چاہئیں۔ ذاتی طور پر مجھے نسبتاً طویل خاکے پسند ہیں اور ہو سکتا ہے میں خود جب اس میدان میں قدم رکھوں تو شخصیت کا مکمل تجزیہ کرنے کے شوق میں ضرورت سے زیادہ صفحے کالے کرنا شروع کردوں۔ جہاں تک سلمان باسط کے خاکوں کا تعلق ہے، ان کی اولین شناخت اجمال و اختصار ہے۔ سلمان

باسط نے خاکوں میں واقعات کی شمولیت سے شعوری گریز کیا ہے۔ اس نے قوت منجیدہ پر کم کم انحصار کیا ہے اور شخصیت کے اوصاف کی حقیقی بازیافت پر اپنے خاکوں کی بنیاد رکھی ہے۔ فنی اعتبار سے اس کے مختصر سے مختصر خاکے میں بھی تکمیلیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تکمیلیت میرے نزدیک آغاز اور انجام کے مابین ایک خاص جمالیاتی وحدت کا نام ہے۔ سلمان باسط کے خاکوں میں مجھے افسانے اور ڈرامے کے بعض لوازمات آپس میں گھلتے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ وہ افسانہ نگار بھی ہے اور اس کا ڈرامہ بھی پی ٹی وی پر بس چلا ہی چاہتا ہے۔

سلمان باسط کے خاکوں کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ان میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ کوئی لفظی قرینہ آزمائے کہ محاورے کا استعمال کرے کہ مشاہدے کا جادو جگائے کہ لفظوں میں تصویر کھینچے کہ مضحک صورت حال بیان کرے لطافت اور شگفتگی اور حس مزاح ہر جگہ رواں دواں ہے۔ فن خاکہ نگاری کے مطابق خاکہ صرف طنزیہ یا مزاحیہ صورت حال کا نام ہرگز نہیں ہے۔ بعض سراسر سنجیدہ خاکے بھی لکھے گئے ہیں کہیں کہیں سنجیدگی اور مزاح میں برابر برابری تقسیم بھی ہے لیکن غالباً پہلی دفعہ اردو ادب میں سلمان باسط مختصر مزاحیہ خاکوں کو متعارف کرا رہا ہے۔

سلمان باسط نے اپنے خاکوں میں بعض لطیفوں کو بھی حسب موقع جڑ رکھا ہے لیکن اس کی نثر کا کلی مزاج بذات خود اتنا شگفتہ اور لطیف ہے کہ اسے اس کی ضرورت نہ تھی تاہم اسے میراثیوں اور سکھوں کے لطیفے بہت پسند ہیں۔ کیوں پسند ہیں؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

سلمان باسط بلا کا جملے باز ہے یہ ان لوگوں میں سے ہے جو بندہ ضائع کر دیتے ہیں جملے کا زیاں نہیں ہونے دیتے۔ اس نے اپنے خاکوں میں ایک سے ایک جملہ چست کیا ہے۔ اس کی حس مزاح ہر جگہ اپنی جولانی دکھاتی ہے۔ سلمان نے مزاح کے بہت سے قرینے آزمائے ہیں مثلاً وہ لفظی توڑ پھوڑ کا ماہر ہے، شخصیت کے مضحک پہلوؤں کی نشاندہی سے کام لیتا ہے اور کبھی کبھی تحریف کا فن بھی آزماتا ہے۔ اس کے ہاں کہیں تو ”تبسم زیر لب“ کی کیفیت ملتی ہے اور کہیں ”ترنم بالائے ناف“ کی۔ آئیے مزاحیہ صورت حال کی چند گوارا مثالیں ملاحظہ کرتے ہیں:

عثمان خاور صاحب سلمان باسط کے بڑے بھائی ہیں اس نے اپنے ”بھائی جان“ کو بھی نہیں بخشا۔ ظاہر ہے جو اپنے پول کھول سکتا ہے اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی ہے عثمان خاور ایئر فورس سے سکواڈرن لیڈر ریٹائرڈ ہوئے ہیں دیکھیے، سلمان کی رگ ظرافت پھڑکتی ہے:

”تمغوں سے یاد آیا کہ موصوف کو فوجی سروس کے دوران چند تمغوں سے بھی نوازا گیا تھا جن میں تمغہ خدمت، تمغہ بسالت اور تمغہ خجالت وغیرہ شامل تھے“

اس نے عثمان خاور صاحب کی جو درگت بنائی ہے وہ آپ خاکے میں خود پڑھ لیجئے مجھے تو عثمان خاور کی دھیمی گفتگو پر بے ساختہ رحم آیا:

”موصوف اتنی دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے انتہائی قریب بیٹھے ہوئے شخص کو بھی انہیں سننے کے لئے آلہ سماعت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے غالباً“ انہیں صرف بات کرنا مقصود ہوتا ہے سنانا نہیں“

روف امیر کے خاکے میں اس کے ایک شعر کی تفہیم کا جواب نہیں:

”امیر کس کو خبر تھی مری کہ یہ بچہ
بڑا ہوا تو بہت باشعور نکلے گا“

”ہمیں یقین ہے کہ جس روز یہ بچہ واقعی بڑا ہو گیا بہت باشعور ہو کر اس بستی سے نکلے گا“

مستنصر حسین تارڑ کی جہان پرستی کا اظہار جمیل ملاحظہ فرمائیے:

”مردوں سے دوستی کرتے وقت وہ اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ دوست کا تعلق اس مٹی سے پھوٹنے والی کسی ذات سے ہو یاں دوسری صنف کے ساتھ معاملات میں وہ خاصا روشن خیال ہے“

محمد حمید شاہد کے اعوان ہونے کا ذکر مطلوب تھا لیکن زیب داستان کیلئے کیا کچھ بڑھا دیا ہے:

”مجھے آج تک اعوانوں کی سمجھ نہیں آئی..... مثلاً حمید شاہد بھی

اعوان ہیں اور ریما بھی اعوان ہے، اظہار الحق بھی اعوان ہے اور محمد خان ڈاکو بھی، مولانا محمد اکرم بھی اعوان ہیں اور اپنا رؤف امیر بھی۔ یاد آیا ایک دفعہ ہم دونوں یعقوب آسی کے گھر گئے تھے جہاں پر لطف چائے کے ساتھ بد مزہ بسکٹ کھانے کو ملے تھے میں تو بھول بھال گیا لیکن اس ”زود فراموش“ نے ایک ایک تفصیل یاد رکھی یعقوب آسی کے خاکے میں لاشعور ہوتا ہے: ”موصوف نے ایک دکان بھی کھول رکھی ہے۔ وہ عقیقہ چونکہ غیر محرموں سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتی اس لئے زیادہ تر پردے ہی میں رہتی ہے اور اپنا گھونگھٹ صرف تب اٹھاتی ہے جب اس کے گھر آئے ہوئے کسی مہمان کے لئے باسی بسکٹوں کے ڈبے یا گھر کے لئے ماچس کی ڈبیوں کی ضرورت پڑے۔“

سلمان باسط اپنے خاکوں میں غضب کی تصویر کشی کرتا ہے۔ خاکے کی تعریف میں ”لفظوں سے کھینچی ہوئی تصویر“ کے معانی بھی پوشیدہ ہیں لیکن سلمان اس فن میں یکتا ہے۔ وہ زیر بحث شخصیت کی ایک ایک حرکت کو یاد رکھتا ہے اور جزئیات نگاری کا کمال دکھاتا ہے۔ تاہم اظہار بیان یہاں بھی مزاحیہ ہے۔ ہم جس شخص کا خاکہ پڑھتے ہیں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ وہ سماعت کے لئے کسی قسم کا ابہام نہیں چھوڑتا اور باتوں باتوں میں تصویر بنا دیتا ہے۔ اس حوالے سے اس کے خاکے مجھے تصویری جھلکیاں معلوم ہوتے ہیں۔

مجھے کہنے دیجئے کہ سلمان باسط کے ہاتھ میں ادیب کا قلم بھی ہے اور مصور کا موقلم بھی۔ مزے کی بات یہ کہ ”مختصر خاکوں“ میں بھی ”مکمل تصویریں“ موجود ہیں کم و بیش ہر خاکہ میں اس نے ایک حصہ ایسا رکھا ہے جس میں شخصیت کے جملہ پہلوؤں کا چند جملوں میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اگر وہ شخصیت کا نام نہ بھی لے تو جاننے والے جانے ہیں کہ کس کا ذکر ہوتا ہے۔ قدم قدم پر اس کی باریک بینی اور مشاہدے کی تیزی نمایاں ہے۔ میں اس بات کا معنی شاید ہوں کہ وہ بہت جلد بندے کو جان جاتا ہے۔ ایک موقع پر ہمیں ایک شخص ملا، چلتا پھرتا خاکہ، بعض لوگ پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کے خاکے لکھے جائیں اور ثواب کے لئے ہر خاکے کی تمیں تمیں نقول تیار کر کے ”مومنین“ میں تقسیم کی جائیں۔ بس وہ ایسا ہی شخص تھا، میں نے

اسے کہا کہ وہ اپنے طور پر موصوف کے اوصاف حمیدہ لکھے اور میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔ جب آراء کا تقابل کیا گیا تو دونوں نے اسے ہونق، بے وقوف اور فائر العقل وغیرہ گردانا تھا (بعد ازاں ثابت بھی یہی ہوا) اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہم دونوں غالب حد تک ہم مزاج ہیں اور یہ کہ سلمان کی حس مشاہدہ کا جواب نہیں۔ آئیے، سلمان باسط کی لفظی تصویروں کی چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

یہی نہیں کہ اس نے اپنے مشاہدے کے ذریعے معلوم کر لیا کہ عوام الناس انور مسعود کی شکل دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ کمال کی تصویر بھی کھینچتا ہے:

”اگر کوئی فارغ البال سا شخص، ادھیڑ عمری کی چھڑی لشکائے ہوئے آنکھوں میں حیرانی لیے ہوئے سر کو کھجاتا ہوا، سرک پر زگ زگ بناتا ہوا، زیر لب کچھ نہ کچھ بولتا ہوا، کبھی مسکراتا، کبھی کھکھلاتا اور کبھی یکدم سنجیدہ ہوتا ہوا آپ کو نظر آئے تو آپ پر لازم ہے کہ اسے انور مسعود سمجھ لیں“

ہم نے اکٹھے سیریں کیں، تھڑے والے ہوٹلوں سے پھیکی چائے اور عملین سی پی اور جانے کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے لیکن مجھے یہ اعتراف ہے کہ شاید میں بھی اتنی جزئیات کے ساتھ انور مسعود کی تصویر نہ بنا سکوں۔ آئیے آپ کو اظہار الحق سے ملواتے ہیں، سلمان باسط کی حس مشاہدہ عینک کے پیچھے سوچتی ہوئی آنکھوں تک کو دیکھ لیتی ہے:

”چہرے پر مشکل سی نیم متشرع داڑھی جو ہر مسلک اور ہر وضع کے لوگوں کو دھوکا دے جاتی ہے۔ اظہار الحق کے چہرے پر جو ایک معتبری برستی ہے اس میں ایک انتہائی خوب صورت فریم میں جی عینک کا بھی دخل ہے۔ عینک کے پیچھے دو بظاہر سوچتی آنکھیں اس کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کی مقناطیسیت پیدا کر دیتی ہیں“

جلیل عالی کے لہجے کی آہستگی اور چہرے کی شرافت سے اس نے عجیب عجیب مطلب کشہ کشہ کیا۔

”بات اتنی آہستگی سے کرتا ہے جیسے کوئی راز کہہ رہا ہو، چاہے وہ صرف یہی کہنے جا رہا ہو کہ وہ سرسید کالج راولپنڈی میں پروفیسر

ہے..... اس کے چہرے پر مظلومیت ٹوٹ کر برس رہی ہے کبھی کبھی
تویوں ہی اسے دو چار روپے تمھارے کو جی چاہتا ہے۔“
اس نے فخرہ بتول کی بے چینی، اضطراب اور سیمابیت کو جس نظر سے دیکھا
ہے وہ اسی کو عطا ہوئی ہے:

”فخرہ کی شخصیت میں پارہ بھرا ہوا ہے۔ آرام سے بیٹھنا اس کے لئے
ممكن ہی نہیں اور کچھ نہیں تو پہلو ہی بدلتی رہتی ہے۔ اٹھتی ہے،
چلتی ہے، فون سنتی ہے، فون کرتی ہے، کتاب لاتی ہے، کتاب رکھنے
جاتی ہے“

یہ تو فقط چند مثالیں ہیں اس کی ساری کتاب مرقع نگاری کا عمدہ اظہار ہے۔
سلمان باسط کی نثر تمام تر ادیبانہ قرینوں سے مرصع لیکن سیدھی سادی رواں
دواں ہے۔ کہیں کہیں اس نے ہم قافیہ نثری ٹکڑے بھی سلیقے سے سجائے ہیں۔ ان
مقفی جملوں کے ذریعے ایک تیرے دو شکار کئے گئے ہیں اول یہ کہ قوانی کے استعمال
سے زور بیان کو موثر بنایا گیا ہے اور دوم یہ کہ مزاح پیدا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی
گئی ہے۔ سلمان باسط رؤف امیر کے لئے رقمطراز ہے:

”وہ بولنے لگتا ہے تو یہ کھولنے لگتا ہے، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو یہ اسے
گنا دیتا ہے، وہ جانا چاہتا ہے تو یہ اسے جاناں کہہ کر پھر سے بٹھا لیتا
ہے۔“

محمد اظہار الحق کے خاکے میں ہم قافیہ لفظوں کے ٹکڑے ملاحظہ ہوں:
”وہ صاحب جلال، شاعر جمال، فارغ البال اور کثیر العیال ہے۔ وہ افسر
غضب کا، شاعر ڈھب کا، کثیر العیال اب کا اور فارغ البال کب کا
ہے۔“

سید مبارک شاہ کا تعارف دیکھئے۔

”وہ نبلا، سید، اصلا، مبارک شاہ ہیں مثلاً شاعر ہیں اور کبسا“
اکاؤٹنس کے محکمے میں افسر ہیں“

انور مسعود کی مشاعرہ بازی کی ایک جھلک یوں ہے:

”جو اپنی آواز، انداز اور بیاض سے ایسا جادو جگاتا ہے کہ ہر دیکھنے سننے والے کو گرد و پیش سے بے نیاز کر دیتا ہے“

فاخرہ بتول کی تعریف میں سلمان نے توانی کا استعمال تو نہیں کیا لیکن لفظ ”نواز“ کے سابقہ محل نظر ہیں:

”وہ مہمان نواز ہے، دوست نواز ہے، ادب نواز ہے اب آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ ستار نواز، سارنگی نواز اور طبلہ نواز بھی ہوگی“

یہی نہیں سلمان باسط کی نثر میں ایک جمالیاتی شان بھی جلوہ گر ہے وہ ہر رنگ اور ہر ڈھنگ کا جملہ لکھنے پر قادر ہے۔ مختلف جگہوں سے میں نے نمونے کے طور پر چند جملے اکٹھے کیے ہیں جو اس کی نثر لطیف کے آئینہ دار ہیں:

”شاید کسی دن سورج اس کے بام پر بھی چمکے، سنہرے دن پتکھ پارے اس کے آنگن میں بھی اتر آئیں اور مہربانوں کی کھکشاں اس کے آسمان پر بھی نمودار ہوں“

”جیسے صاف شفاف ٹھنڈا میٹھا پانی میری رگوں میں اتر گیا ہے، جیسے اس مد و جزر سے میری ساری شخصیت، میری ساری شاعری زیر آب آگئی ہے“

اگر سلمان باسط کے آخری جملے کی پیروی کروں اور اس میں ”خاکی خاکے“ کو خراج تحسین پیش کروں تو یہ جملہ کچھ ایسے ترتیب پائے گا:

”جیسے گدلا میلا گرم کڑوا پانی میری رگوں میں اتر گیا ہے جیسے اس طوفان بد تمیزی سے میری ساری شخصیت، میرا سارا ادب زیر خاک آ گیا ہے“

قارئین محترم! آپ نے میرے لہجے میں اپنائیت اور بے تکلفی کو محسوس کیا ہو گا۔ اگر آپ نے کبھی میرا کوئی سنجیدہ مضمون پڑھا ہے تو یقیناً ”دو گولی شیر کے نشان والی خریدی ہوگی۔ ویسے میں خود خشک تنقیدی اصطلاحات اور منطقی نوعیت کے تجزیوں سے بور ہو رہا تھا کہ سلمان باسط کے خاکے ہاتھ آ گئے۔ میرا انداز خلاف توقع ہلکا پھلکا اور نیم شگفتہ رہا۔ اسے ”صاحب کتاب“ اور ”دبیاچہ نگار“ کی باہمی رضامندی پر محمول

کیا جائے لیکن آپ نے دیکھا اب ماشاء اللہ میں ایک مستند دیباچہ نگار کا درجہ اختیار کر گیا ہوں۔ میری تنقیدی صلاحیتیں آج کل خاصے عروج پر ہیں جن لوگوں کا ارادہ ہے کہ وہ کبھی کوئی کتاب لکھیں گے دیباچے کیلئے ابھی سے کہہ دیں۔ مختصر کتاب کا مفصل اور مفصل کتاب کا مفصل ترین دیباچہ لکھنے میں مجھے یہ طویل حاصل ہے۔

سلمان باسط کی کتاب میں خاکوں کی کل تعداد چودہ ہے۔ مجھے دیباچہ نگاری میں مشغول چھوڑ کر گزشتہ شام وہ عمرے کیلئے پرواز کر چکا ہے۔ یقیناً "آپ کو اس پر رشک آ رہا ہوگا کہ ابھی تو "روشن دور جوانی کا" پورے جوہن پر ہے اور یہ جوان صالح ایسی ایسی نیکیاں کما رہا ہے لیکن ٹھہریے، صرف میں آپ کو یہ راز بتا سکتا ہوں کہ وہ عمرہ کرنے کیوں گیا ہے، اس لئے کہ حج فرض ہونے میں ابھی چھیاسی خاکے باقی ہیں۔

ماہ دسمبر، سن اٹھانوے کا عشرہ آخریں

جواز

جنوری ۱۹۸۱ء کے اوائل کے دن تھے۔ پت جھڑ کا موسم رگوں تک میں اتر گیا تھا۔ موسم کی بخ بستی مزاجوں میں بھی جھلکتی تھی۔ لاہور کی سڑکوں پر خزاں رسیدہ پتے راہ گیروں کے قدموں تلے چرچا کر دم توڑ رہے تھے۔ گورنمنٹ کالج کا ٹاور کمر آلود فضا میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ کے طلباء و طالبات اداس چہروں کے ساتھ فضل حسین ریڈنگ روم میں بیٹھے جدائی کے گھونٹ حلق سے اتار رہے تھے۔ ہمارے سینئرز اپنی تعلیم کی آخری حد کو عبور کرنے کے بعد ہم سے رخصت ہو رہے تھے۔ شدید دکھ کی اس کیفیت کے دوران میرا نام پکارا گیا۔ مجھے اپنے ہم سبق ساتھیوں اور اپنے سینئرز کی بشری خصوصیات کو ایک اجتماعی خاکے کی صورت میں بیان کرنا تھا۔ میں نے خاکے پڑھنے شروع کئے تو حلق میں آنسو ٹپکتی اداسی کے ماحول میں مسکراہٹیں جگمگانے لگیں جو دبی دبی ہنسی اور پھر کھلے منہ کے قہقروں میں تبدیل ہو گئیں۔ ساری فضا یکسر تبدیل ہو چکی تھی اور میرے اندر ایک نگار کا ورود ہو چکا تھا۔

پھر کبھی کبھار یہ سرکش میری شاعری، افسانہ نگاری اور کالم نگاری کے سینے پر سوار ہو جاتا اور بھگنڈا ڈالنے لگتا۔ بالآخر اس نے اپنا وجود یوں تسلیم کروا لیا کہ میری کوشش اور خواہش کے باوجود دوسری اصناف سے قبل ہی اپنا مجموعہ تیار کر لیا۔ آج ”خاکِ خاکے“ کی صورت میں یہ آپ کے سامنے ہے۔

مجھے بہت کچھ کر لینے یا شاید کچھ بھی کر لینے کا دعویٰ ہرگز نہیں۔ اردو خاکہ نگاری کے میدان میں بہت سے معتبر نام موجود ہیں۔ میں نے نہ تو کسی کا انکار کیا ہے اور نہ ہی کسی کی اتباع کی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے صرف ان شخصیات کے خاکے لکھے ہیں جن سے مجھے محبت ہے۔ ان میں سے زیادہ تر میرے بہت گہرے دوست ہیں۔ ان شخصیات کی تمام جزئیات میرے سامنے تھیں۔ ان میں بڑے اور معروف لوگ بھی شامل ہیں اور چند کم معروف بھی لیکن ان کی بڑائی میں کم از کم مجھے کوئی شبہ نہیں۔ نہ صرف ادب میں ان کی قامت بلند ہے بلکہ ان کی بشری حیثیت بھی پیسا کے مینار سے کم نہیں۔ پیسا کے مینار کی مثال سے شاید آپ چونکے ہوں لیکن آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک خاکہ نگار کیلئے پیسا کا مینار اسفل ثاور سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہذا یہ تھوڑے تھوڑے ٹیڑھے یا سرکے ہوئے سمیرے دوست میرے لیے پیسا کا جھکا ہوا مینار ہیں۔

میں خاکہ نگاری کو بھی دوسری اصناف کی طرح ایک سنجیدہ اور معتبر صنف خیال کرتا ہوں لیکن جانے کیوں کسی بھی مذکورہ شخصیت کا نہایت سنجیدہ خاکہ مجھے اس طرح دکھائی دیتا ہے جیسے سائنس کے طالب علموں کو کسی ایسڈ کی جملہ خصوصیات کے بارے میں نہایت تفصیل لیکن احتیاط سے لیکچر دیا جا رہا ہو۔ ہر شخص نمکین، میٹھی اور کڑوی صفات کا مرکب ہوتا ہے۔ انہی صفات کو بیان کرتے وقت اگر تناسب میں فرق آجائے تو شاید نہ شخصیت کا اعتبار قائم ہو اور نہ ہی خاکہ نگار کا۔ پھر بادام کھاتے ہوئے ایک آدھ کڑوے بادام سے منہ تو بن ہی جاتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے میٹھا بادام کھا لینے سے ساری کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے۔ میں بھی میٹھے باداموں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں کھڑا بادام رکھ دیتا ہوں لیکن منہ کا ذائقہ خراب نہیں ہونے دیتا۔

مجھے اپنے دوست عزیز بھی ہیں لیکن ممکنہ حد تک میں شخصیت کے جائزے میں انصاف سے ضرور کام لیتا ہوں۔ میرے نزدیک خاکے سے ہستی مذکور کی شخصیت اس طرح نکھر کر سامنے آنی چاہیے کہ اس کی بشری حیثیت کا اعتبار قائم رہے اور اسے فرشتہ بننے سے بچایا جاسکے۔ خوبیاں، خامیاں کچھ اس طرح مدغم ہو کر سامنے آئیں کہ تلچٹ کہیں بہت نیچے رہ جائے اور شخصیت کی محبوبیت کسی بھی صورت متاثر نہ ہو۔ مزاح کا عنصر ایسی کیفیت کو جنم دینے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ

وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان خاکوں میں مزاج جتنی مقدار میں بھی جھلکتا ہے اتنی ہی مقدار میں یہ میرے مزاج میں شامل ہے۔ کہیں پر کوئی بھی بات صرف اہتمام کی خاطر نہیں کی گئی۔

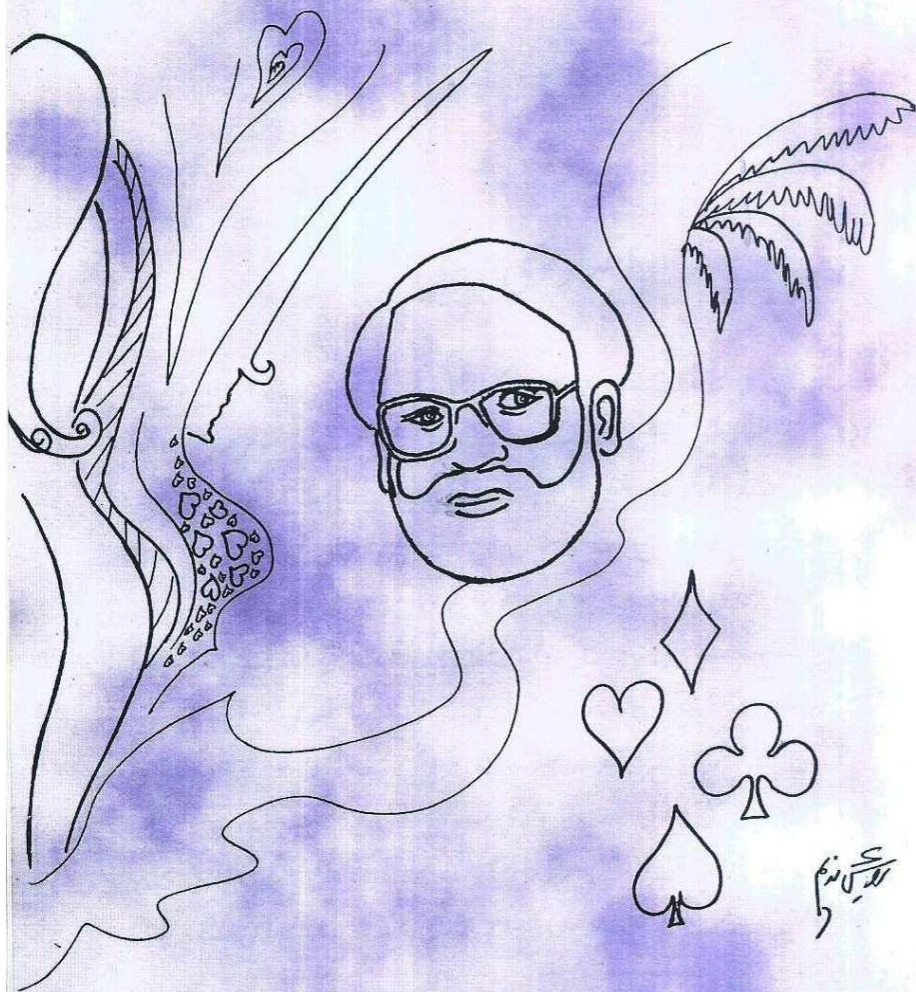
طویل خاکے لکھنے سے میں نے شعوری طور پر گریز کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعات کی مدد سے خاکوں کو لمبا کرنا بذات خود اس صنف کے ساتھ بددیانتی کے مترادف ہے۔ شخصیت کے حوالے سے جتنی بھی بات بنتی ہے میں نے ہر خاکے میں بیان کر دی ہے۔ بہر حال حقیقت میں کہیں کہیں ناگزیر سطح پر فکشن کا لمس شاید ہر ادبی تخلیق کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ اختصار سے کام لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آج کے قاری کے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں خود جلدی میں تھا۔ شاید اختصار کا اس کے علاوہ کوئی جواز میرے پاس نہیں۔

کتاب کی اشاعت میں مجھے اتنے دوستوں کا تعاون حاصل ہے کہ ایک طویل فرسٹ ہے جسے یہاں سمیٹنا شاید ممکن نہ ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ پاس کے تمام حروف اپنے انتہائی عزیز دوست محمد حمید شاہد کی نذر کروں جس نے بے پایاں محبت کا ثبوت دیتے ہوئے عرق ریزی سے کتاب کو تمام مراحل سے گزارا، غفور شاہ قاسم کی بے لوث چاہت کا تذکرہ کروں جس نے مجھے اس کتاب کی اشاعت کیلئے مائل اور قابل کیا، اپنے شاگرد روش ندیم کی سعادتمندی کا شمار کروں جس کی بولتی لکیروں نے میرے خاکوں کو مزید جاندار بنا دیا، یار طرحدار رؤف امیر کے صدقے جاؤں یا واہ کینٹ کی ادبی تنظیم ”صریر خامہ“ کے تمام اراکین کے پر خلوص اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا اعتراف کروں، میرے لئے یہ ایک مشکل مرحلہ ہے۔ پھر اکثر دیکھا گیا ہے کہ پیش لفظ میں مختلف لوگوں کے نام اس طرح شامل کئے جاتے ہیں جس طرح پنجاب کے دیہات میں شادی بیاہ کے موقع پر ”نیوندرا“ ڈالا جاتا ہے جسے وقت آنے پر واپس کرنا اخلاقی اور سماجی مجبوری ہوتی ہے۔ لہذا میں اس روایت سے انحراف کرتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا حساب دل میں رکھتے ہوئے ”خاکي خاکے“ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

سلمان باسط

واہ کینٹ

اظہار بھی مشکل ہے، محمد اظہار الحق



اظہار بھی مشکل ہے

بچپن کی سرحدوں کے آس پاس ایک فلمی نغمہ سنا تھا جس کے ابتدائی بول کچھ یوں تھے ”اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے“ میرے معصوم اور نسبتاً ”کم باشعور ذہن نے اظہار کے لفظی مفہوم سے نابلد ہونے کے باعث اسے کسی شخص کا نام جانا۔ کیونکہ میرے بچپن کے دوستوں میں سے ایک انتہائی کم خن دوست کا نام اظہار تھا۔ شعوری بلوغت نے در ابہام تو وا کر دیا مگر میرا دل اس لفظ کا کوئی اور مفہوم ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوا۔ برسوں بعد اظہار الحق کو دیکھا تو میرا مطلوبہ مفہوم کھٹ سے سامنے آ گیا۔ سرتاپا مشکل ہی مشکل۔ سربا لخصوص مشکل۔ چہرے پر مشکل سی نیم متشرع داڑھی جو ہر مسلک اور ہر وضع کے لوگوں کو دھوکا دے جاتی ہے۔ شریعت، وضع داری اور دنیا داری کے اصولوں پر مرتب شدہ یہ داڑھی اظہار الحق کے چہرے کا پہلا عکس ہے داڑھی کے بعد آنے والی جنئیات اگرچہ زیادہ اسلام پسند نہیں مگر چونکہ ہمارے ہاں اسلام بتدریج نافذ ہو رہا ہے اس لئے پریشانی والی کوئی بات نہیں۔

اظہار الحق کے چہرے پر جو ایک معتبری برستی ہے اس میں ایک انتہائی خوبصورت فریم میں جی عینک کا بھی دخل ہے یقیناً آئے تو عینک اتروا کر دیکھ لیں۔ عینک کے پیچھے دو بظاہر سوچتی آنکھیں اس کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کی

مقامیست پیدا کر دیتی ہیں اور وہ پہلے سے زیادہ مدبر دکھائی دینے لگتا ہے۔ چہرہ ہر حالت میں بالکل سپاٹ رہتا ہے جیسے کہ وہ جذبات سے یکسر عاری ہو مگر حقیقت اس سے مختلف ہے اس شخص کے اندر بھی نیچان پنا ہوتا ہے مگر وہ اسے ظاہر نہیں ہونے دیتا اس وقت بھی وہ کم و بیش اسی کشمکش میں مصروف ہے اور دیدہ بینا کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔

محمد ضیاء الحق کے بعد محمد اظہار الحق ایک ایسا نام ہے جو اپنے اندر ایک آہنگ لیے ہوئے ہے۔ اظہار الحق میں بھی ضیاء الحق والا جلال خروانہ موجود ہے اور اس کے چہرے سے بھی منعکس ہوتا ہوا مارشل لاء کا شفیق چہرہ چھپائے نہیں چھپتا۔ اتفاق سے وہ ایک بیوروکریٹ بھی واقع ہوا ہے اور ہزار تہمت دوسروں کے سر دے کر فرقہ افر شاہی میں داخل ہوا ہے اگر معاملہ برعکس ہوتا تو اس کے سر پر چند بالوں کے ساتھ ساتھ تہمتوں کے انبار بھی ہوتے مگر وہ تہمتیں لینے کا عادی ہی نہیں اوریوں بھی کوچہ ملامت سے صاف بچ نکلنے والے شخص کو کوئی تہمت کیسے دے سکتا ہے۔ اس نے کھی گئے کنستروں میں گھرے ہونے کے باوجود پانچوں انگلیاں تو کجا ایک انگلی بھی ڈبونے کی کوشش نہیں کی۔ شاید یہی اس کی طمانیت کی وجہ ہے۔

اظہار الحق اکاؤنٹس کے محکمے کا ایک اعلیٰ افسر ہے اور بلا کا افسر ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک ایسے دفتر کا چارج سنبھالا جسے اس کے پیشرو کو ایک زبردست تحریک کے نتیجے میں تبدیل کروانے کا شرف حاصل تھا اظہار الحق نے حالات کی نبض پر دھیرے دھیرے ہاتھ رکھنا شروع کیا۔ اپنے مزاج کے برعکس ملائمت سے ماتحتوں کے ساتھ پیش آنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ ایک دن یونین کے سرکردہ لیڈر کو بلا بھیجا نہایت راز داری سے اسے پوچھا کہ پچھلے افسر کے خلاف آپ نے جو پمفلٹ چھپوائے تھے اگر آپ کے پاس کوئی بچا ہو تو ذرا مجھے بھی دکھائیں۔ یونین لیڈر نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ ”سر! وہ اشتہار تو ختم ہو گئے ہیں اگر آپ چند دن ٹھہر جائیں تو مزید چھپوانے کا بندوبست کیا جاسکتا ہے“ اظہار ایسے جواب سننے کا عادی تو نہ تھا مگر خون کے گھونٹ چنا جیسے محاورے کو بھی آخر استعمال کا کوئی موقع چاہتے۔

اظہار الحق ایک سیمابی شخصیت کا نام ہے۔ آنے والے لمحے میں اس کا رد عمل

کیا ہوگا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ شاک اکیچھج کے بھاؤ کی طرح اس کے مزاج میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ آپ کو اگر کبھی اس کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہو آپ نہایت معتبر اور معزز بن کر اس سے گفتگو میں مصروف ہوں گے وہ بھی آپ سے نہایت مہربانی سے بات کر رہا ہوگا۔ آپ اگر کبھی ایک آدھ بار جانے کی اجازت مانگیں گے تو وہ مزید ٹھہرنے پر اصرار کرے گا۔ یکدم کسی آفت زدہ لمحے میں وہ آپ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہے گا۔ ”اچھا جی پھر خدا حافظ“۔ آپ اپنی باری پر حیران بھی ہوں گے اور پریشان بھی مگر اگلے ہی لمحے وہ خود دفتر سے باہر ہوگا۔ ہمارے کئی دوست کئی بار اس عبرت کدے میں جا چکے ہیں اور اس مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو چکے ہیں ہم چونکہ دوسروں کے تجربے سے سیکھنے کے عادی ہیں اس لئے تاحال اس تجربے سے محروم ہیں۔ بالکل اس طرح اظہار آپ کو فون کرے گا آپ لائن پر آئیں گے دوسری طرف سے ازمنا و سطر سے آتی ہوئی ایک آواز سنائی دے گی ”جناب آپ کیسے ہیں؟“ آپ جواب میں نہایت خوشدلی سے اپنی خیریت کی اطلاع دیں گے اور اپنی آواز میں انتہا درجے کی شائستگی پیدا کرتے ہوئے چند لمحات تک گفتگو کا پروگرام ترتیب دیں گے کہ ”اچھا“ کی آواز کے ساتھ ٹیلی فون بند ہو جائے گا۔ یعنی آپ کے ساتھ صرف اس شرط پر فون پر بات ہو سکتی ہے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہو اور آپ طویل تو کیا مختصر گفتگو کرنے کی بھی پوزیشن میں نہ ہوں۔

اظہار الحق وسط ایشیا کی ریاست ازبکستان کو قدم بوسی کا شرف بخش چکا ہے۔

سمرقند میں شیشہ در شیشہ سرخ شہوت کے

بہشت اس کے میوؤں سے شرمایا تھا اور میں اس میں تھا

یہ حیرت انگیز شعر اس نے سمرقند میں اپنے قیام کے بارے میں لکھا ہے میں بھی اس کی دیکھا دیکھی سمرقند و بخارا کا سفر کر چکا ہوں مگر جہاں تک نظر گئی کسی بھی ذہین اور دانشمند ازبک کو شیشوں میں شہوت کا رس ڈال کر پیتے نہیں دیکھا۔ وہ لوگ اس معاملے میں زیادہ باذوق واقع ہوئے ہیں۔ شیشے میں سرخ رنگ کا مشروب ضرور ہوتا ہے مگر اس سے کسی قسم کا اسلامی جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ ہاں ہم جیسے سادہ دل لوگ اسلام دوستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اپنے ازبک مسلمان بھائیوں کو چشم

تصور میں شہوت کا رس پیتے ہی دیکھتے ہیں۔

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

تاشقند سے لوٹتے ہوئے ہمارے ہم وطن خاصے ایمان شکن تجربوں کی پوٹلی
باندھ کر ہمراہ لاتے ہیں مگر اظہار الحق سرقند و بخارا کے گلی کوچوں سے واپسی پر اپنے
ہمراہ مدرسہ میر عرب، مسجد بالائے حوض، قلعہ امیر، مشاہدہ گاہ الغ بیگ، مزار امام
بخاری، آرام گاہ خواجہ بہاؤ الدین نقشبند اور شاہ زندہ سے اسلامی تاریخی اور تہذیبی
پس منظر کے ٹکڑے اٹھا لایا ہے اور انہیں حال کے تناظر میں رکھ کر جوڑنے کی
کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی پوری زخمی اور آنکھیں نم ہو جاتی
ہیں مگر اس کی اٹھان جس ماحول میں ہوئی ہے وہ اسے جواں حوصلگی عطا کرتی ہے۔
اس کا المیہ یہ ہے کہ وطن واپسی پر اسے نہ تو کوئی گوش نصیحت نیوش ملتا ہے اور نہ
کسی دیدہ عبرت نگاہ سے واسطہ پڑتا ہے۔

معاف کیجئے گا شاید آپ اسے مدح سرائی پر محمول کریں مگر جب اظہار الحق
جیسی وضع دار شخصیت کا ذکر ہو رہا ہو تو احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ ہی جاتا ہے۔
اظہار الحق کے عناصر ترکیبی بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔ وہ صاحب جلال،
شاعر جمال، فارغ البال اور کثیر العیال ہے۔ وہ افرغضب کا، شاعر ڈھب کا، کثیر العیال
اب کا اور فارغ البال کب کا ہے۔ ویسے آپ جو بھی کہہ لیں اس کے سر پر جوں تک
نہیں ریگنتی۔

مجھے یہ خاکہ لکھنے سے پہلے بہت سے دوستوں نے بہت ڈرانے کی کوشش کی
بعض دوستوں نے کہا کہ اظہار بہت زود رنج ہے برا مان جائے گا مگر میرے پاس اس کا
اپنا دیا ہوا لائسنس موجود تھا۔ میں نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔

ایسے ناداں بھی نہیں جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو راہ گزر تو دیکھو

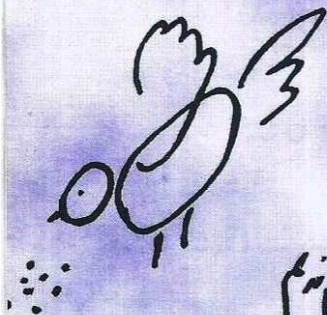
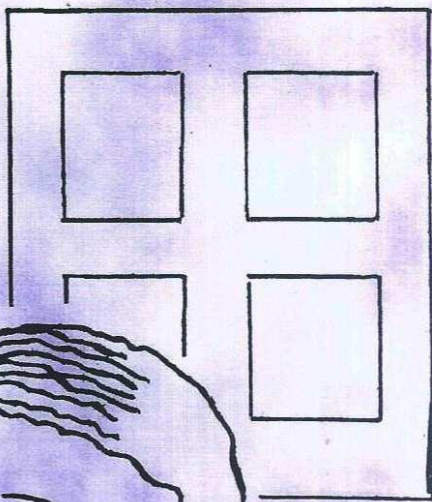
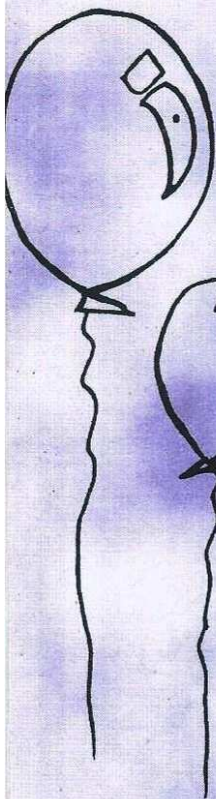
اظہار الحق کی شخصیت کی اتنی جہتیں ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنے سے میرے
خلاف ایف آئی آر بھی کٹ سکتی ہے مگر اس کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو اس کی
شاعری ہے جس کو اس سے کبھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک ایسا تناور پیڑ ہے جس

کے سائے میں اگنے والے پودے کبھی پھول پھل نہیں سکتے۔ آپ ہی ایمان سے کہتے کہ دیوار آب، غدر اور پری زاد جیسی کتابوں کے خالق سے مسحور ہوئے بغیر کیسے رہا جاسکتا ہے۔ اس کی شاعری ایک طلسم کدہ ہے تو اس کی شخصیت ایک حیرت کدہ اور مجھ جیسے لوگ جب حیرت کی انگلی تھام کر اس طلسم کدہ میں داخل ہوتے ہیں تو پتھر کے ہو جاتے ہیں۔

میں نے اظہار الحق کا خاکہ لکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کی شخصیت ڈھلی ڈھلائی میرے سامنے آگئی.... میں نے چند حرف ترتیب دیئے اور خاکہ مشکل ہو گیا۔ ممکن ہے وہ اسے پڑھے اور ناراض ہو جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ میری تنخواہ کا بل بھی پاس ہونے سے رہ جائے مگر کیا کیا جائے کہ:

اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے

مجمع باز، انور مسعود



سید

مجمع باز

اگر کوئی ”فارغ البال“ سا شخص، ادھیڑ عمری کی چمڑی لشکائے آنکھوں میں حیرانی لئے، سر کو کھجاتا، سڑک پر زگ زیگ بناتا، زیر لب کچھ نہ کچھ بولتا، کبھی مسکراتا، کبھی کھلکھلاتا اور کبھی یکدم سنجیدہ ہوتا آپ کو نظر آئے تو آپ پر لازم ہے کہ اسے انور مسعود سمجھ لیں۔ اس دوران آپ اسے سلام کر لیں، گالی دے لیں یا اس کے سامنے سے چپ چاپ گزر جائیں وہ کسی قسم کے رد عمل کا مظاہرہ نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس وقت کسی قسم کے رد عمل ظاہر کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہوگا اور ایسا صرف اس لئے ہے کہ وہ اس وقت ایک ایسی کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے جس سے صرف ایک مان، شاعر یا بھینس واقف ہیں۔ یہ ماں، شاعر اور بھینس کی مثلث میں نے ارادتا بیان کی ہے کیونکہ ایک تو باپ، نثر نگار اور بھینسا بہر حال اس کیفیت سے نا آشنا ہوتے ہیں اور فریق ثانی کی مذکورہ کیفیت کے دوران بھی مزے سے ڈکارتے رہتے ہیں۔ دوسرے بھینس انور مسعود کا محبوب استعارہ ہے۔

انور مسعود جیسے پینڈو نما شہری کو جاننا ہرگز مشکل نہیں اس کیلئے صرف گجرات کے مضافات سے دونوں جوتیاں ہاتھ میں تھام کر اسلام آباد تک سفر کرنا پڑتا ہے۔ جوتیاں ہاتھ میں تھانے کی وجہ اگر آپ کو سمجھ نہیں آئی تو سمجھ لیں کہ آپ کا کسی

گجراتی سے واسطہ نہیں پڑا۔ گجرات سے اسلام آباد آ کر بندہ آباد تو ہو جاتا ہے مگر عموماً اسلام کو گھر میں لوہے کے اس صندوق میں بند کر کے آ جاتا ہے جس میں فینائل کی گولیوں کے ساتھ تہہ کر کے سردیوں کے کپڑے رکھے جاتے ہیں۔ انور مسعود چونکہ کچھ زیادہ ہی پینڈو تھا لہذا اسلام والا صندوق بھی ساتھ ہی اٹھا لایا اور اسے اسلام آباد میں آباد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی کوششیں ہنوز جاری ہیں اور اب وہ اس ملک کے شہریوں کو ”کتکتاریاں“ نکال کر اسلام نافذ کرنے کی معصوم کوشش کر رہا ہے۔

اس کے پینڈو ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس بھی پینڈو ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے چہرے کے عضلات سے گندلوں کے ساگ اور مکئی کی روٹی کی بھلک اس کے دیہاتی پن کی چغلی کھاتی ہے۔ اس کی ہنسی بھری مسکراہٹ اسے ایک سینکڑ میں جناح سپر مارکیٹ سے جلال پور جٹاں لا کھڑا کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک وہی حیرانی ٹھہری ہے جو پہلی بار شہر آنے پر اور بتیاں دیکھنے پر اسے لاحق ہوئی تھی اور اس کی منہ بھر کر بے موقع سچ بولنے کی عادت تو اسے ساری عمر شہری نہیں بننے دے گی۔ یوں آپ بڑے آرام سے اس دیہاتی سٹے مکالمہ کر سکتے ہیں۔

انور مسعود کا نمایاں وصف اس کی مجمع بازی ہے۔ وہ بات کر رہا ہو، کلاس میں لیکچر دے رہا ہو، شعر سنا رہا ہو، شعر سن رہا ہو یا سڑک پر چل رہا ہو اس کے گرد ایک ہجوم ہوتا ہے۔ مشاعروں میں تو بالخصوص وہ ایک مجمع باز دکھائی دیتا ہے جو اپنی آواز، انداز اور بیاض سے ایسا جادو جگاتا ہے کہ ہر دیکھنے سننے والے کو گرد و پیش سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ نتیجتاً گھر سے سبزی لینے کیلئے نکلنے والا شوہر، بچوں کے کپڑے خریدنے کی خاطر آنے والی بیوی، چاکلیٹ کی خواہش میں نکلا ہوا بچہ اور دوائی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا بوڑھا بھی اس کی ”مہربان“ قدردان“ والی زبان سے مسحور ہو کر اس کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور دیکھتا جاتا ہے، سنتا جاتا ہے، سنتا جاتا ہے، دیکھتا جاتا ہے۔

انور مسعود کی وجہ شہرت تو اس کی مزاحیہ شاعری ہے (وجہ رسوائی بھی تا حال شاعری ہی ہے) حالانکہ اس کا سنجیدہ کلام بھی اتنا ہی توانا ہے۔ اب یہ ایک المیہ ہے کہ لوگ اس کی سنجیدہ شاعری سن کر بھی ہنسا شروع کر دیتے ہیں اور لوگوں کی ہنسی اس کی شخصیت سے اتنی پیوستہ ہو چکی ہے کہ عوام الناس اس کی شکل دیکھتے ہی ہنسا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ بھی لوگوں سے خوب خوب بدلے لیتا ہے اور ہنساتے ہنساتے اچانک اس طرح چٹکی کاٹ دیتا ہے کہ شدت طرب سے نکلے ہوئے آنسو شدت الم سے نکلنے والوں آنسوؤں میں مدغم ہو جاتے ہیں اور اس طرح زبان کے بگاڑ کے سارے اور بندروں جیسی بے مقصد جد و جد کرنے والے ان پچھلے مزاحیہ شاعروں کو بھی ایک آدھ استعرااتی چپت رسید کر دیتا ہے جنہیں آج تک سمجھ نہیں آئی کہ لوگ ان کی شاعری سن کر ہنستے ہیں یا ان کی شاعری پر ہنستے ہیں۔

ایک طویل عرصہ پروفیسری کی زندگی گزار چکنے کے بعد انور مسعود اب ریٹائر ہو چکا ہے اگرچہ ریٹائرمنٹ سے قبل کی اور بعد کی زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا اور اس کی بے ڈھنگی چال میں اب بھی وہی پروفیسرانہ بے نیازی قائم ہے جو پہلے تھی مگر پھر بھی ریٹائرمنٹ کے ساتھ وارد ہونے والے عارضوں سے وہ کما حقہ مستفید ہو رہا ہے اور شاید اس لیے بھی ہو رہا ہے کہ لفظ عارضے کی صوتی و ترکیبی نسبت نہایت محبوبانہ ہے۔ بندہ شاعر ہو اور محبوب کا ذکر ہو تو بہت سے عارضے تو یوں بھی گلے لگنے کو تیار ہوتے ہیں۔ انور مسعود نے پروفیسری ”نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کو“ کے انداز میں کی ہے۔ نہ تو وہ پرنسپل حضرات کا قرب حاصل کرنے کیلئے کبھی بے چین رہا ہے اور نہ پرنسپل صاحبان اس کے فراق میں مرغِ لبّال کی طرح تڑپے ہیں۔ بس ایک واجبی سا افسری ماتحتی کا تعلق تھا جو خدا خدا کر کے تمام ہوا۔ بہر حال اس کا تعلق اس کے طلباء سے مستقلاً قائم ہے جو اس کی اولین ترجیح ہے۔

کھانا اور اچھا کھانا ہمارے شاعر دوست کو بہت مرغوب ہے گرم روٹی کے ساتھ مرغی، مچھلی یا بھنا گوشت انور مسعود کی سب سے پسندیدہ غذا ہے۔ ساتھ سلاد بھی ہو تو اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ روٹی وہ ہمیشہ گرم پسند کرتا ہے تندور کی گرم گرم روٹی

جس کے اوپر ”بلبلوں“ کی متعدد سطحیں ہوں اور جو کڑکڑ کر رہی ہو اسے بہت پسند ہے خواہ وہ بعد میں اس کے معدے میں تخیر ہی کیوں نہ کرے۔

انور مسعود بہت اچھا میزبان ہے فراخ دل ہے، مگر خود دعوت دینے میں خاصا بخیل ہے۔ اس کی فراخ دلی دیکھنے کیلئے اس سے زبردستی دعوت لینا پڑتی ہے مگر ایک دفعہ جب وہ یہ سلسلہ شروع کرتا ہے تو پھر دسترخوان دراز کرتا چلا جاتا ہے دھیان رہے کہ دسترخوان دراز کرنے اور وسیع کرنے میں بڑا فرق ہے۔

وہ ایک محبت کرنے والا خاوند ہے چونکہ بیگم صاحبہ سے زمانہ طالب علمی کی یادیں وابستہ ہیں اس لئے محبت کا لامتناہی سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ محبت کی اسی مٹھاس کی بدولت وہ شوگر کا مریض بن چکا ہے اگرچہ اپنے شوگر لیول کو کنٹرول کرنے کیلئے وہ خشک چنے بکثرت کھاتا ہے مگر محبت کی بے اعتدالیوں سے لاحق ہونے والی شوگر بھلا خشک چنوں سے کیا کنٹرول ہوگی۔

چونکہ انور مسعود ایک بین الاقوامی شاعر بن چکا ہے لہذا وہ بیرون ملک بھی اکثر و بیشتر مدعو کیا جاتا ہے۔ بیرونی دوروں کے پس پردہ اس کے متنوع مقاصد بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر ان مقاصد کا علم سینٹ کے ممبران کو ہو جائے تو بہت ممکن ہے کہ وقت سے پیشتر ہی شریعت بل پاس ہو جائے لہذا بہت سے خود غرض و ذاتی منفعت کے عادی لوگوں نے اس کی بیرونی سرگرمیوں کو اس طرح چھپا رکھا ہے جیسے حکومت سی ٹی بی ٹی کے معاملے کو چھپاتی ہے۔ سنا ہے کہ امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا اور دیگر ایمان شکن ممالک کی حسینائیں انور مسعود کے اشعار سن کر پھڑک پھڑک جاتی ہیں اور "How sweet! old boy!" کہتے نہیں ٹھکتیں۔ جواباً انور مسعود بھی دہن مسعود کو تاحد امکان شرقاً غرباً پھیلا پھیلا کر "Very Sweet! Young lady!" کہتا جاتا ہے اور اپنی قسمت پر ناز کرتا جاتا ہے۔

یاد آیا کہ کچھ عرصہ قبل انور مسعود نے دلیپ کمار کیلئے بھی ایک نظم کہی تھی۔ جواباً دلیپ کمار نے انور مسعود کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے بھی اردو مزاحیہ شاعری کا دلیپ کمار قرار دیا تھا۔ شاید کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا وہ دلیپ کمار

جتنا بڑا نام تو ہے ہی شاید ایکٹر بھی اتنا ہی بڑا ہے۔ اس کے شعر پڑھنے کے انداز میں بھی کم از کم نگار ایوارڈ کے پائے کی ایکٹنگ ضرور پائی جاتی ہے۔ بہر حال دلیپ کمار کا لقب ملنے کے بعد انور مسعود نے آئینے کے سامنے اپنے سراپے کو متعدد زاویوں سے دیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور خوابوں میں اور سراپوں میں پاک و ہند کی تمام خوبرو ہیروئنوں کے ساتھ لہک لہک کر اور مٹک مٹک کر باغوں اور پارکوں میں گانے گاتا ہے اور ڈانس کرتا ہے۔

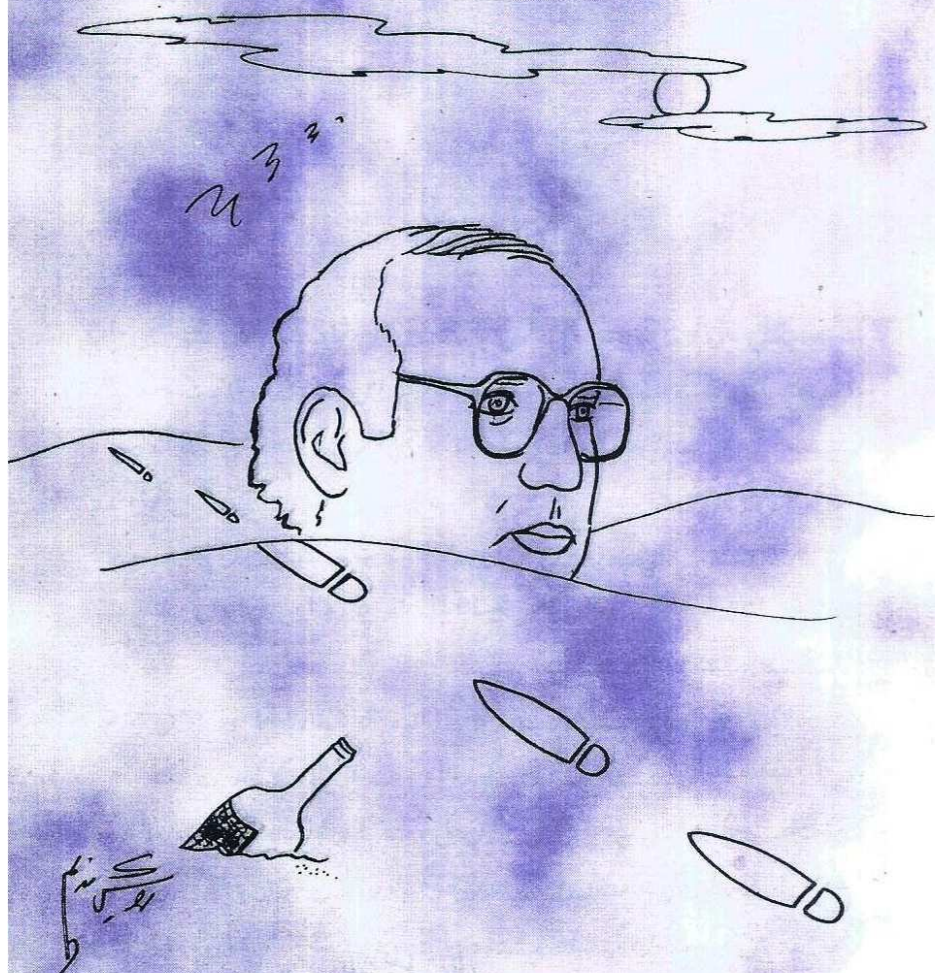
مشاعروں، دعوتوں اور دوستوں کی محفلوں میں اسے بکثرت پان کھاتے اور دوسروں کی ڈبیا سے گولڈ لیف گے سگریٹ پیٹے اور ٹی وی اشتہاروں والے سٹائل میں کش لیتے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ سب کام وہ صرف تماش بینی کے شوق میں کرتا ہے ورنہ گھر میں بیگم کے سامنے تو وہ مجھض ایک شریف النسل مغل ہی نظر آتا ہے جسے دیکھ کر مغلیہ خاندان کے زوال کا ایک اور سبب سمجھ میں آ جاتا ہے۔

انور مسعود ایک سیلف میڈ شخص ہے جس نے عسرت زدہ زندگی بھی گزاری اور محنت کر کے معاشرے میں بلکہ دنیا میں ایک مقام بنایا۔ شاید اسے یہ سارے انعامات اس لئے ملے ہیں کہ اس نے اپنے والدین کی اور بالخصوص آخری عمر میں نابینا ہو جانے والے والد کی بے انتہا خدمت کی۔ ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والا انور مسعود اتنا متکسر المزاج ہے کہ کبھی کبھار شک سا ہونے لگتا ہے کہ وہ واقعی ایک بڑا اور مشہور آدمی ہے یا صرف حسن رضوی ہے۔ ویسے خاصی تنگ و دو یا ”لو اور دو“ کے بعد اب تو حسن رضوی بھی ایک معروف آدمی بن چکا ہے۔

انور مسعود وقت اور وعدے کا بہت پابند ہے۔ اس کی یہ صفت اس کی شاعرانہ حیثیت کو خاصا مشکوک بنا دیتی ہے۔ لیکن اس کو اپنے اصولوں سے پیار ہے اور ان پر اسے کسی قسم کی سودے بازی پسند نہیں۔ وہ درحقیقت ایک بڑا آدمی ہے اور اس کیلئے اسے کسی قسم کی مشقت نہیں کرنا پڑی۔ وہ جتنی سہولت سے شعر کہہ لیتا ہے جتنی آسانی سے بڑی سے بڑی بات کر لیتا ہے اور جس قدر فراوانی سے سچ بول لیتا ہے میرے لئے یہ سب مقام حیرت ہے۔

انور مسعود کا سفاری سوٹ اور اس کا گنجا سراتنی مشہور چیزیں ہیں کہ ان سے ہٹ کر اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا دراصل اس کی تمام تر شخصیت اس کی کھلی باجھوں، دو چار بے ترتیب زلفوں، حیران آنکھوں اور شعر پڑھنے کے پچیلے انداز میں پوشیدہ ہے اور اس سے محبت کرنے والوں کو اس کے اسی انداز سے محبت ہے اور وہ انہیں اسی شخصیت میں قبول ہے۔ ویسے بھی ہمارے قبول و بول کرنے سے کیا ہوتا ہے ایک نیک بخت پر ۳۵ سال پہلے یہ کڑا امتحان پڑا تھا تو اس نے قبول کر لیا تھا، لہذا ہمیں بھی قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔

جناب عالی، جلیل عالی



جناب عالی

جلیل عالی کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں لیکن شاید جلیل عالی مجھے نہیں جانتا امید ہے اس خاکے کے بعد جان جائے گا۔ اگرچہ اس سے میری ملاقات بہت پہلے سے ہے اور اس سے محبت اور دوستی کا رشتہ تادم آخر قائم ہے لیکن مجھے اندیشہ سا ہے کہ اس کی شخصیت کے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی میری کوشش کہیں کوئی اور گل نہ کھلا دے بہر حال پندرہ بیس لوگوں کے خاکے لکھنے کے بعد بندہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے رؤف امیر جیسا ایک نقاد پندرہ بیس فنکاروں کے پرچے اڑانے کے بعد بے شرم ہو جاتا ہے۔

ایک شخص کنویں کے کنارے بیٹھا ہوا اندر جھانک رہا تھا اور پچیس پچیس پکارتے جا رہا تھا قریب سے ایک شخص گذرا اس نے کنویں کے کنارے بیٹھے شخص سے استفسار کیا کہ بھائی یہ کیا پچیس پچیس کی رٹ لگا رکھی ہے آخر بات کیا ہے؟ کنویں والے نے کوئی جواب دیے بغیر اندر جھانکنا اور پچیس پچیس ہانکنا جاری رکھا۔ راہ گیر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر قریب آیا اور کنویں کے اندر جھانکنے لگا۔ کنویں والے نے فوراً اسے دھکا دے کر اندر گرا دیا اور با آواز بلند پکارنے لگا ”چھیس“ چھیس، چھیس۔ سو بھائیو! ایک دن جلیل عالی مجھ سے پوچھ بیٹھا کہ اب تک کتنے خاکے لکھ چکے ہو جس کا سادہ سا نتیجہ یہ ہے کہ آج میں بھی ”چھیس چھیس“ پکار رہا

ہوں۔ اب کسی اور بھائی نے کچھ پوچھنا ہو تو بتائے۔

جلیل عالی کا نام سنتے ہی ہر شخص کے ذہن میں یہ وسوسہ پھن اٹھانے لگتا ہے کہ شاید وہ جمیل الدین عالی کا بھائی ہے نتیجتاً لوگ اس سے دوہے، رزمیہ گیت پنٹھارے دار سفرناموں اور بد مزہ کالموں کی توقع رکھتے ہیں لیکن جب یہ حقیقت ان پر منکشف ہوتی ہے کہ اس کا جمیل الدین عالی سے کوئی رشتہ نہیں تو پھر کہیں جا کر لوگ اس کو قبول کرنا شروع کرتے ہیں اور پھر اس کی شخصیت، شاعری اور استادی کے ہنر سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں کہ جمیل الدین عالی سے رشتے کا مغالطہ دور کہیں پیچھے رہ جاتا ہے اور نکھرا نکھرا صاف شفاف جلیل عالی ابھر کر سامنے آجاتا ہے جو لوگوں سے کہتا ہے دیکھو میں پتھر کے شہر میں آئینہ سازی کرتا ہوں اور ان آئینوں میں پھول کھلاتا ہوں لیکن آئینوں میں کھلے ان پھولوں کو کوئی چھو نہیں سکتا صرف ان کی خوش رنگی اور خوش سیلیگی کی داد دے سکتا ہے۔

جلیل عالی کی شخصیت کو اگر غور سے دیکھا جائے تو سفاری سوٹ عینک اور سر کا چاند سب سے نمایاں ہیں اگر اس میں دائرہی اور مونچھوں کی مشابہ جگہ پر جیلٹ بلیو ٹو کا کمال بھی شامل کر لیا جائے تو شخصیت کو کچھ تزکا سا لگ جاتا ہے اس کے چہرے پر کربناک قسم کی سنجیدگی اگرچہ کسی قسم کی بردباری کا مظاہرہ نہیں کرتی مگر شاید عالی نے یہ اہتمام اسی لئے کر رکھا ہے۔ ناپ تول کر بولنا اور بات گول کر کے مسکرانا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ بات اتنی آہستگی سے کرتا ہے جیسے کوئی راز کہہ رہا ہو چاہے وہ صرف یہی کہنا چاہ رہا ہو کہ وہ سرسید کالج راولپنڈی میں پروفیسر ہے لیکن لہجے کا دھیمپا پن اور گفتگو کا ٹھہراؤ اس کی اس بات کو بھی سرسستہ راز بنا دے گا اور یوں لگے گا جیسے وہ ایٹم بم بنانے کا فارمولہ بتا رہا ہے۔

پروفیسر سے یاد آیا کہ وہ تو ہنوز پروفیسر ہے مگر ہماری بھابھی پنڈی کے ایک اہم کالج میں پرنسپل ہیں۔ ایک پرنسپل کا رعب و دبدبہ اور ٹھاٹھ بانٹھ تو کوئی پروفیسر ہی جان سکتا ہے۔ ہمارے دوست کے ساتھ دوہری زیادتی یہ ہے کہ کالج میں بھی اسے ایک پرنسپل سے واسطہ پڑتا ہے اور گھر میں بھی وہ ایک عدد پرنسپل کے ماتحت ہے۔ کالج میں تو پرنسپل صرف پیپڈ ہی پڑھواتا ہے مگر گھر والا پرنسپل تو برتن بھی دھلواتا ہے

اس کی ساری دانشوری جھوٹے برتنوں اور صفائی کرنے والے کپڑوں میں کہیں چھپ جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کے اندر کی مردانگی کروٹ لے کر بیدار ہوتی ہے مگر پھر دسمبر میں ACR کا خوف اسے اس تنخواہ پر کام کرنے پہ مجبور کر دیتا ہے۔

اس کے چہرے پر مظلومیت ٹوٹ کر برسی ہے کبھی کبھی تو یونہی اسے دو چار روپے تمہا دینے کو جی چاہتا ہے۔ جانے اس کے چہرے پر اتنا پریشان کن خوف کیوں مسلط رہتا ہے۔

جلیل عالی بہت زود رنج شخص ہے اگرچہ مشرقی پنجاب سے دیرینہ تعلق کے باعث بات اسے ذرا دیر سے سمجھ آتی ہے مگر جب آ جاتی ہے تو وہ ناراض ہونے کو اپنا فرض اولین سمجھتا ہے فریق ثانی کو حریف اول سمجھ لیتا ہے پلٹتا ہے جھپٹتا ہے جھپٹ کر پلٹتا ہے لیکن ساری ایکسرسائز کا مقصد صرف لمو کو گرم رکھنا ہوتا ہے کرتا ورتا وہ کچھ بھی نہیں۔ یوسف حسن اور احمد جاوید کی بورڈوائی ترقی پسندی کے سامنے وہ سینہ سپر ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات رجعت پسندی کا لیبل بھی ماتھے پر چپکا بیٹھتا ہے مگر اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے اندر گھس کر بیٹھی ہوئی جماعت اسلامی باہر نہیں نکلتی۔ شاید یہ صرف جماعت اسلامی نہیں ہے بلکہ پورے کا پورا اسلام اور پاکستان ہے جس سے محبت اس کی رگ رگ میں رچی ہے جو اس کی پہچان بھی ہے جس کے بارے میں وہ بجا طور پر حساس ہے اور جس پر وہ کبھی کبھو مائز نہیں کرتا۔

محبت اور خوش خلقی جلیل عالی کی شخصیت کا خاص وصف ہے۔ عجز و انکسار کا تو وہ پیکر ہے۔ یہ باتیں میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ آپ اس سے مل کر دیکھ لیں بات کر لیں اس کی شاعری پڑھ لیں آپ میری باتوں اور میرے دعووں کی نفی کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی حد سے گزرتی ہوئی شرافت تو اختر عثمان جیسے مختصر جغرافیہ رکھنے والے شخص کو بھی اس کے سامنے اکڑنے اور برسنے کی سہولت عطا کرتی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ شرافت ہی شرافت میں بات دل میں رکھ لیتا ہے جبکہ دوسرا شخص بھڑاس شراس نکال کے فارغ ہو جاتا ہے۔

ہمارے اس نہایت پیارے دوست نے ایک طویل عرصہ واہ میں بھی قیام کیا ہے سو وہ اب تک اس شہر کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے۔ واہ کی سڑکوں پر گھومتے وقت

وہ بے کل ہو جاتا ہے۔ اس شہر کی محبت اس کی رگوں میں ابلنے لگتی ہے اور پھر وہ جذبات میں آکر یہاں گزرتے ہوئے ان خوبصورت دنوں کو یاد کرنے لگتا ہے جب جوانی اسے دیکھ کر مسکراتی تھی اور وہ جوانی کی مہکار میں سانس لیتا تھا۔ اب اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جوانی اس سے رخصت ہو چکی ہے وہ تو اب بھی اس کے آس پاس منڈلا رہی ہے بس اب ذرا اسے دیکھ کر مسکراتی نہیں۔ بالکل اس محبوبہ کی طرح جو التفات بھی نہ کرے اور سینے پر مونگ دل کر قریب رہتے ہوئے بھی دوسروں پر نگاہ غلط انداز ڈالے۔

جلیل عالی نے آج کل ایک اور شوق پال رکھا ہے ان دنوں وہ انٹرنیٹ پر دنیائے بھر کے علم و فن سے استفادہ کر رہا ہے اب اگر آپ کے ذہن میں اس علم و فن اور انٹرنیٹ کے ذکر سے کلٹن اور مونیٹا سکیڈنڈل کا خیال آجائے تو قصور میرا ہرگز نہیں۔ آج کل کلٹن تو اس طرح انٹرنیٹ پر چھایا ہوا ہے جس طرح امریکہ پوری دنیا پر تسلط جمائے ہوئے ہے لیکن جس طرح امریکہ دنیا بھر پر چھائے رہنے کے باوجود بدنام ہے اسی طرح کلٹن بھی انٹرنیٹ پر ہر وقت موجود رہنے کے باوجود صرف اخلاق باختگی کا پیکر نظر آتا ہے۔ بہر حال ہمیں تو اپنے جلیل عالی کا تذکرہ مقصود ہے جو انٹرنیٹ پر کلٹن اور مونیٹا کی غیر شرعی تصاویر اور تفصیل صرف اس لیے دیکھتا ہے تاکہ بعد میں اس کی اخلاق باختگی پر تفصیل سے گفتگو کر سکے اور اپنے مسلمان بھائیوں کو حقیقت سے آگاہ کر سکے لیکن انٹرنیٹ پر اس نے دنیا بھر کی حسیناؤں سے گفتگو کا سلسلہ جانے کس لئے قائم کر رکھا ہے شاید اس میں بھی امت مسلمہ کی کوئی بھلائی مضمر ہو جو ہماری ناقص عقل میں نہ آتی ہو۔

کچھ عرصہ قبل جلیل عالی نے ایک آنکھ کا آپریشن کروایا ہے۔ یار لوگوں کا خیال ہے کہ اس آپریشن کی ضرورت کسی بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ آنکھ کے ضروری و غیر ضروری استعمال کی وجہ سے پڑی ہے۔ شاید ایک آنکھ زیادہ استعمال ہوتی رہی ہے۔

سر سید کالج میں اس کا وجود ادب کیلئے نعمت ہے خود کالج کیلئے اس کا وجود کیسا ہے اس بارے میں یا اس کے شاگرد بتا سکتے ہیں یا اس کے پرنسپل پروفیسر غلام سرور

صاحب۔ سرسید کالج کا ادبی جریدہ سرسیدین ہر سال اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ پاکستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات وہ سرسیدین کا حصہ بناتا ہے اور اس کی چمک دمک میں اضافہ کرتا ہے۔

بچے تلے قدموں سے چلنا کوئی جلیل عالی سے سیکھے۔ اسے چلتا دیکھ کر جانے کیوں دوڑنے کو جی چاہتا ہے غالباً وہ ایک قدم اٹھانے کے بعد سوچتا ہے کہ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

لیکن اس کے ساتھ چلنے والا عجیب سی الجھن کا شکار رہتا ہے۔

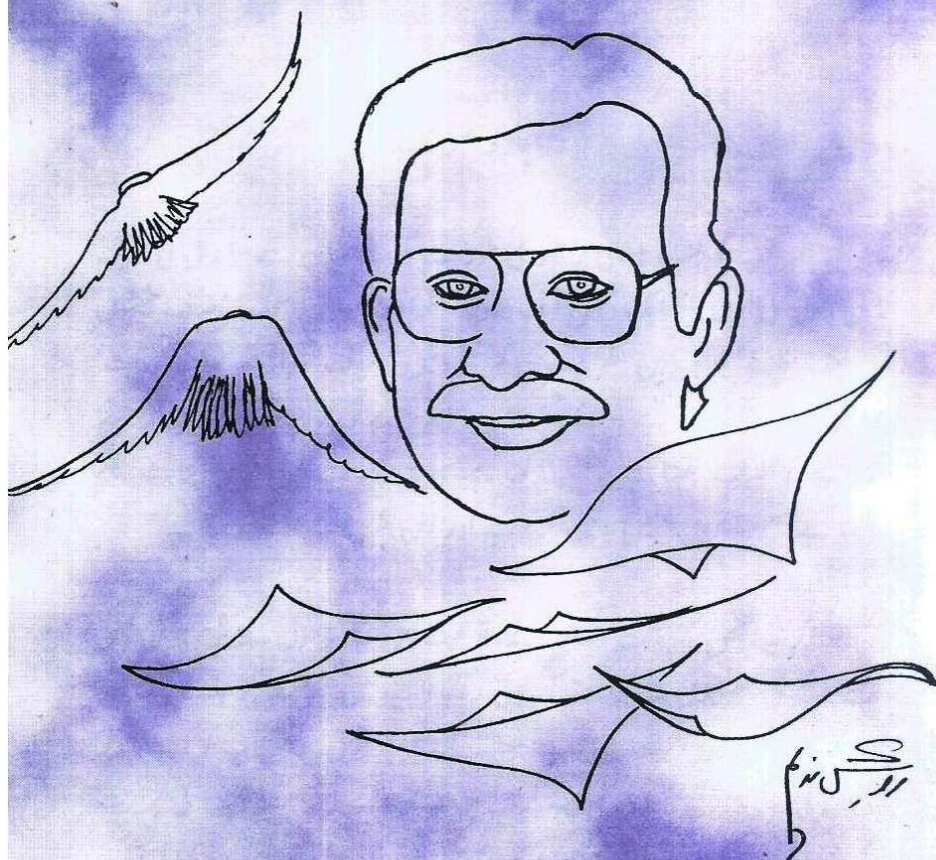
میں نے قبل ازیں اس کی شرافت کا ذکر کیا تھا بعض لوگ اس کی شرافت کو بچپن کے کسی نفسیاتی واقعے کا اثر قرار دیتے ہیں بعض اس کی شرافت کو خوف کی سرحد کے اندر شامل کر دیتے ہیں اور بعض لوگ تو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں اور اس کی شرافت کے بارے میں نہایت غیر منقول مثالیں دینے لگ جاتے ہیں مگر یہ طے ہے کہ اس کی شرافت و نجات قرون وسطیٰ کے مسلمانوں سے ملتی جلتی ہے۔

جلیل عالی کے قد آور شاعر ہونے کے ثبوت کے طور پر اس کی دو کتابیں بہت بڑی سند ہیں۔ نوجوان نسل میں وہ جس تیزی سے شاعری کا وائرس پھیلا رہا ہے اس سے مجھے وہ سردار جی یاد آ جاتے ہیں جن سے کسی نے شکایت کی۔

”سردار جی آپ اپنی اہلیہ کی غیر اخلاقی حرکات کو کنٹرول کریں وہ سارے گاؤں کو خراب کر رہی ہے“ سردار جی نے بڑے رمان سے جواب دیا ”لو! گاؤں کیسا؟ یہاں چار چھ تو گھر ہیں۔“ سو جلیل عالی اپنی خوبصورت شاعری کے تیزی سے پھلتے وائرس کے بارے میں یہی عذر پیش کرتا ہے کہ دو تو کتابیں ہیں۔



جادوگر، محمد حمید شاہد



جادوگر

اگر آپ کو کشادہ پیشانی پر عمودی طور سے گرتے سیاہی سے سفیدی کی طرف مائل بالوں کی لٹوں والا ایک شخص ایک دلاویز مسکراہٹ لبوں پر سجائے، صاف شیشوں کی عینک لگائے، بظاہر ذہین نظر آنے کی کوشش میں مصروف، دراز قد، صاف رنگت، خردوار قسم کی ناک اور گٹھے ہوئے جسم سمیت نظر پڑے تو پہچان جائیے کہ یہ محمد حمید شاہد ہے جو افسانے لکھتا ہے ”نہیں“ کہتا ہے، سیرت نگار ہے، ادبی خبریں دیتا ہے، کالم لکھتا ہے، ”استعاروں“ میں باتیں کرتا ہے اور اس طرح کے بے شمار ”سلسلے“ قائم رکھتا ہے۔

اگر یہ شخص آپ سے مصافحہ کرے تو محبت اس کے ہاتھوں کے گرم جوش لمس سے آپ کی ہتھیلیوں کے راستے آپ کی رگ و پے میں سرایت کر جائے گی۔ اور اگر آپ کو اس خوبصورت آدمی سے معافہ کرنے کا اتفاق ہو تو آپ کو اپنے اندر جذبوں کی تپش اترتی محسوس ہوگی۔ گردن پر دیئے ہوئے اس کے بوسے کی حرارت ایک مقناطیسیت بھر دے گی۔ آنکھوں میں محبت، تشکر اور جذباتیت کے باہمی اشتراک سے عجیب سی چمک آجائے گی اس کے بعد کبھی آئینے میں اپنا سراپا دیکھئے گا۔ آپ کو اپنا آپ اس سے قبل کبھی اتنا خوبصورت، اتنا اجلا اور اتنا سچا نہیں لگا ہوگا کیونکہ یہ سب اس جادوگر کا کرشمہ ہے جسے ”حمید شاہد“ کہتے ہیں۔

حمید شاہد سے میری دوستی بظاہر پرانی نہیں مگر محبتوں کو قریب آنے میں کتنی دیر

لگتی ہے۔ ایسی خوبصورت چیزوں کو دل کے شیف پر سجانے میں کتنا وقت چاہیے۔ سو تھوڑے ہی عرصے میں حمید شاہد میرے اتنا قریب آ چکا ہے کہ میں اس کے اندر سرسراتی ہوئی چاپ بھی سن سکتا ہوں۔ اس کی باتوں کی خوشبو کو محسوس کر سکتا ہوں۔ اس کی آنکھوں سے پھوٹنے والی پھوار میں خود کو بھگو سکتا ہوں۔

حمید شاہد زرعی بینک میں افسر ہے۔ اگرچہ اسے دیکھ کر زراعت، بینک اور افسری کا شائبہ تک نہیں گزرتا اور کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے ہے کہ حمید شاہد جھوٹ بول رہا ہے وہ کسی زرعی بینک میں افسر نہیں وہ تو ویسٹ کوٹ کی اوپر والی جیب میں پین سجانے والا ایک معصوم سا آدمی ہے جسے زراعت اور بینکنگ جیسے اکٹا دینے والے شعبوں سے کوئی تعلق نہیں اور افسری تو معاذ اللہ۔ لیکن روٹی کمانے کیلئے اسے یہ سب کچھ بھی کرنا پڑتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کسان بھائیوں کو زرعی قرضوں کی بجائے افسانوی قرضے ملتے ہیں۔ بینک کاری کی بجائے فن کاری زیادہ پنپ رہی ہے اسے اپنے افسر سے زیادہ افسر خوں کی فکر رہتی ہے۔ لیکن ایسا ہونا ہی چاہیے ورنہ حمید شاہد اور زرعی بینک کے عام سے افسر میں کیا فرق رہے۔

حمید شاہد کے مشاغل بہت متنوع ہیں اسے بیک وقت مذہب اور خواتین سے لگاؤ ہے ان دونوں کے لئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتا ہے۔ دونوں کے لئے بے حد جذباتی ہے وہ ایک ہی وقت میں ”پیکر جمیل“ جیسی سیرت کی کتاب اور ”جنم جنم“ جیسے اشتہار انگیز رومانوی مجموعے تخلیق کر سکتا ہے۔ دونوں کے متعلقین کی خاطر مدارت جی لگا کر کرتا ہے۔

نماز، خوشبو اور عورت سے متعلق حدیث اسے بہت پسند ہے اور کثرت سے بیان کرتا نظر آتا ہے اس کے آخری جز کو زیادہ شد و مد کے ساتھ سناتا ہے اور مقدور بھر تشریح کرتا ہے اور اس حد تک کرتا ہے کہ نماز اور خوشبو کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اگرچہ مذہب اور خواتین، دونوں سے اس کو وابستگی اور انیسیت بہت زیادہ ہے لیکن کہیں کہیں ترازو کا ایک پلڑا زیادہ جھک جاتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کم بخت ایمان شکن معاشرے میں کون سا پلڑا زیادہ جھکتا ہے لہذا اس میں حمید شاہد کا زیادہ قصور نہیں۔

میرے اس دوست کو صرف ادب تخلیق کرنا ہی پسند نہیں بلکہ اسے شائع کرنا

اور اس کی ترویج کرنا بھی پسند ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک پندرہ روزہ ادبی اخبار ”سلسلہ“ کے نام سے جاری کئے رکھا اور حیرت انگیز طور پر کامیابی سے چلایا جس میں ادبی خبریں اور رپورٹیں شائع ہوتی رہیں۔ اس میں بہت کام کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں مثلاً غفور شاہ قاسم خیریت سے میانوالی پہنچ گئے۔ حمید قیصران دنوں افسانہ لکھنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اصغر عابد اپنی پینٹ رفو کروانے درزی کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں پہچان لیا۔ فاخرہ بتول عہد جدید کی سب سے بڑی شاعرہ ہیں۔ ارشد چہال نے مضمون لکھ لیا ہے۔ حامد سراج نے مضمون لکھوا لیا وغیرہ وغیرہ۔ آپ یقین کریں میرے لئے یہ تمام خبریں نئی ہوتیں اور میں کیا میرے جیسے کئی بے خبر اور کم علم ان سے فیض یاب ہوتے۔ لیکن میں جب یہ تمام خبریں اپنے دماغ میں ٹھونس کر اور معتبر و باخبر آدمی کا تاثر چہرے پر قائم کئے دوسروں کو چونکا دینے کی خاطر سناتا تو ہرگز حیران نہیں ہوتے بلکہ میری طرف حیرت اور شک سے دیکھتے یہ معمہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔

حمید شاہد کے ادبی ادارے کا نام ”استعارہ“ ہے شاعر حضرات تو مجبوراً استعاروں سے کام لیتے ہیں لیکن ایک ادیب اگر استعارے سے کام لے بلکہ کام نکالے تو انسان ٹھک جاتا ہے۔ ویسے ایمان لگتی بات یہ ہے کہ اس کے اس ادارے نے بہت خوبصورت کتابیں شائع کی ہیں۔ اس ادارے کی شائع کردہ کتابوں کے اولین صفحات پر اکثر ”انصرام۔ یا سمین حمید“ لکھا ہوتا ہے جس سے بہت سے اردو شاعری کے قارئین کو ایک معروف شاعرہ کا شاہد ہوتا ہے میں آج ان تمام خوش فہم حضرات کی غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ دراصل ایک خوبصورت اتفاق ہے کہ ہماری بھابھی اس شاعرہ سے نام کی مطابقت و مماثلت رکھتی ہیں۔ اور یہ دراصل ہمارے بھائی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنی ہر عاجزانہ پروڈکشن کو بیگم کے نام سے منظر عام پر لاتا ہے۔ اس کی اس بیگم نواز کوشش کو بعض لوگ اپنی مرضی کی عینک سے دیکھتے ہیں اور اس کو خلوص سے زیادہ زن مریدی جیسے لالچنی نام دیتے ہیں۔ لیکن حمید شاہد کا دل بالکل نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اصغر عابد بھی تو ہے جو ابھی تک نماز بھی خاتون اول (معاف کیجئے گا) قبلہ اول کی طرف رخ کر کے پڑھتا ہے۔

حمید شاہد ذات کا اعوان ہے۔ مجھے آج تک اعوانوں کی سمجھ نہیں آئی۔ ہر

دوسری ذات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے چہرے مرے، رنگ و روپ اور خصائل و عادت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہوتی ہے۔ جو نسل در نسل منتقل ہوتی جاتی ہے لیکن اعوان آپ کو ہمیشہ تضاد عکس کا شکار نظر آئیں گے۔ مثلاً حمید شاہد بھی اعوان ہے اور ریما بھی اعوان ہے۔ اظہار الحق بھی اعوان ہے اور محمد خان ڈاکو بھی۔ مولانا محمد اکرم بھی اعوان ہیں اور اپنا رؤف امیر بھی۔ شاید اسی لئے حمید شاہد اپنے نام کے ساتھ ذات نہیں لکھتا۔ اچھا کرتا ہے جو لکھتے ہیں وہ کون سی توپ چلا لیتے ہیں۔

حمید شاہد نے اتنی تھوڑی سی مدت میں پانچ چھ کتابیں تصنیف کر لی ہیں اگر اس کی رفتار یہی رہی تو اردو نثر کا فرحت عباس شاہ بن جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے اس دوست فرحت عباس نے ادب پڑھنے والوں کے لئے نہیں بلکہ خریدنے والوں اور خطوں میں شعر لکھ کر بھیجنے والوں کیلئے لکھا ہے جبکہ ہمارے اس دوست حمید شاہد نے ادب صرف پڑھنے والوں اور حظ اٹھانے والوں کیلئے لکھا ہے۔ الفاظ کی ایسی نشست و برخاست، فقرات کی ایسی چستی اور افسانوی لب و لہجہ کی ایسی مٹھاس کے گھائل نہ کرے۔ ایسا ہی ادب دل کو بھا جانے والا ہوتا ہے۔ جو پتہ بھی نہ چلنے دے اور Sweet Peas کو چھو کر آنے والی ہوا کی طرح دماغ کو معطر کر دے۔

محمد حمید شاہد کے نام کے تین حصوں پر آپ کو حیرانی ہوئی ہوگی لیکن یہ اہتمام کسی ہنگامی ضرورت کے لئے کیا گیا ہے جیسے ایک محفل میں اتفاقاً "حمید شاہد کی ملاقات ایک دلکش خاتون سے ہو گئی۔ کچھ گفت و شنید کا سلسلہ چلا تو ہمارے دوست نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے نام پوچھ لیا۔ خاتون نے ایک ادا سے کہا "یعنی" حمید شاہد نے موقع غنیمت جانتے ہوئے جھٹ سے کہا "پھر تو ہم یعنی شاہد ہوئے نا!"۔

حمید شاہد کا جو مختصر سا عکس میں نے آپ کو دکھایا ہے یہ بڑا سچا اور خالص ہے لیکن کہیں کہیں کچھ کہنے اور کچھ چھپانے کی کوشش میں ڈالنا بھی ڈالنا پڑا۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب میں اس کی گنجائش ہوتی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو باتیں میں نے آپ کو بتائی ہیں میں ان میں سے اکثر کا "یعنی شاہد" ہوں۔



گورداس پور کا پینڈو، داؤد طاہر



سیدرا
افسان

قونہ

رقوہ

استون

تیم

بندیر

طهران

سینا اور

کرسن

سید

ایمان



الانکس

۳ مارچ ۱۹۹۲
۶:۳۰ صبح

سائنس دان کا نام
اسات نام کا نام

کرسن سید

گورداس پور کا پینڈو

داؤد طاہر کا تصور ذہن میں آتے ہی ایک چھریرے بدن والے نوجوان نما بزرگ کی شبیہ سامنے آتی ہے۔ ساتھ ہی سفاری سوٹ، عینک کے پیچھے سے نبھانکتی شرارتی سی آنکھیں، بے تکلف گفتگو، ایک کھٹکتا ہوا بے ساختہ تقہم، قدرے گرد آلود آواز اور جمال میں چھپا افسرانہ جلال کھٹ کر کے برآمد ہو جاتا ہے۔

داؤد طاہر سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں لیکن اس کے محبت بھرے بے تکلفانہ انداز نے برسوں کی خلیجیں پاٹ دی ہیں۔ وہ یوں ایک دم سے کھل کر اور پوری چکا چوند کے ساتھ سامنے آ گیا ہے کہ مجھے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھنا پڑے ہیں۔ اس کے ساتھ تکلف، روایت یا رسمی جملوں کے ساتھ ملا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ دو منٹ میں مخاطب کا سارا منافقانہ تکلف لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر یوں اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے کہ دوسرا شخص مدافعت کے قابل بھی نہیں رہتا۔ ایسی ظالمانہ بے تکلفی سے ہمارا خود غرض، منافق اور بزدل معاشرہ کو سوں دور ہے۔ ایسا کیوں ہے میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔

داؤد طاہر بلا کا سیانا شخص ہے تعلیم بھی سیاسیات کی حاصل کی اور اسے یوں مہارت سے زندگی کے ہر شعبے میں استعمال کیا کہ کیس غلطی کا احتمال نہ رہے۔ نوکری سے لے کر شادی تک اور شادی سے لے کر ادب تک اس کا سیانا پن اور پلاننگ ہر

زاویے سے منعکس ہے۔ ملازمت کیلئے سول سروس کا انتخاب کیا اور سول سروس میں بھی انکم ٹیکس کا۔ اب کون مائی کا لعل ہے جو انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کا نام آنے پر گھٹنوں میں غم آئے بغیر کھڑا رہ سکے۔ وہ اس ڈیپارٹمنٹ کا ایک سینئر آفسر ہے اور سی بی آر میں لوگوں کے جلی اور خفی اثاثوں کی کھوج لگانے پر مامور ہے۔ اگرچہ آج کل برپردہ اس کام کی اجازت نہیں ہے لیکن درپردہ فرائض منصبی انجام دینے میں کیا مضائقہ ہے اور یہ کام انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ داؤد طاہر نے ایک شادی کی ہے اور تین بچے پیدا کیئے ہیں یہ ترتیب شاید اس نے اس لئے رکھی ہے کہ اگر وہ اسے الٹا دیتا تو یار لوگ کوئی کمال نہ سمجھتے۔ بہر حال منصوبہ بندی والوں کے نزدیک اب بھی وہ اسراف کا مرتکب ہوا ہے لیکن اتنی سی بے اعتدالی کی ایسے کاموں میں اجازت ہونی چاہیے ورنہ ازدواجی زندگی انکم ٹیکس کا گوشوارہ بن جاتی ہے جس میں پھر ڈنڈی بھی مارنی پڑتی ہے۔ دیکھا جائے تو ہمارے دوست نے یہاں بھی پلاننگ کی ہے ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ذرا سی چوک سے گھر چوک کا نقشہ پیش کرنے لگتا ہے۔

اس کے سفر نامے جس تزمین و آرائش کے ساتھ فیروز سنز والوں نے شائع کئے ہیں اور جس طرح ان کتابوں پر دھڑا دھڑا مضامین لکھے جا رہے ہیں اور تقاریب ہو رہی ہیں یہ سب داؤد طاہر کے ساتھ لوگوں کی محبت کا ثبوت ہے اور اس کے سیانے پن کی دلیل ہے۔ یہ سفر نامے امریکہ، یورپ و ایشیا کے آٹھ ممالک کی کورس نمائیر کا نتیجہ ہیں۔ یہ عجیب سے سفر نامے ہیں جس میں ہمارے مروجہ سفر ناموں کے قواعد کے مطابق نہ سفر کے دوران ہر سیٹ پر اس کے ساتھ لڑکی براجمان ہوتی ہے جو تھک جانے پر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دے (اور پڑھتے آئے ہیں کہ یہ لڑکیاں ہر دس منٹ بعد تھک جاتی ہیں) نہ اس میں اس کی خوبصورتی کے قصے ہیں۔ نہ کسینو ہیں نہ ناٹ کلب ہیں۔ خدا جانے وہ کون سے امریکہ اور یورپ گیا تھا اب تو شک گزرنے لگتا ہے کہ وہاں گیا بھی تھا کہ سارا سفر نامہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اور انٹرنیٹ پر معلومات حاصل کر کے لکھا ہے۔ قسم لے لیجئے ہم نے جو سفر نامے امریکہ اور یورپ کے بارے میں پڑھے ہیں ان میں ایسی ایسی چٹخارے دار تفصیل موجود ہوتی ہیں کہ

ایمان تازہ ہو جاتا ہے لیکن داؤد طاہر جنس کے بازار میں ادھار کا سودا لے کر جانے کہاں سے آگیا ہے اور کیا سوچ کر آگیا ہے۔ مان لیا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا لیکن ایسا سچ کس کام کا جو دل بھی پشوری نہ کر سکے۔ وہ جتنا بھی سیانا ہو مگر اس معاملے میں اس نے بالکل سوجھ بوجھ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہمارے قارئین کو جس قسم کے چپکے ہمارے مستند سفرنامہ نگار ڈال چکے ہیں اس کے بعد ایسے سعادت مند قسم کے سفرناموں میں کیا لطف رہ جاتا ہے۔ شاید اسی لئے مستنصر حسین تارڑ نے اس کے سفرنامے کو بہو بیٹیوں کیلئے بھی جائز قرار دیا ہے اگر تھوڑا سا مزید سوچا جائے تو عثمان خاور کے سفر نامے ”ہریالوں کے دیس میں“ کے ساتھ اس کے سفرناموں کو بھی ہشتی زیور کے نصاب میں شامل کیا جاسکتا ہے تاکہ بہو بیٹیاں پڑھیں۔ اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنواریں اور ثواب دارین حاصل کریں۔

ایک سمجھداری کا مظاہرہ ہر حال اس نے ضرور کیا ہے کہ بیرونی دوروں کے دوران اہلیہ کی ہمراہی کا تکلف نہیں رکھا ورنہ امریکہ و یورپ کے سفر پر جاتے ہوئے بعض عاقبت نااندیش یہ غلطی بھی کر بیٹھتے ہیں اور بعد میں ساری عمر ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے اور ہتھیالیاں مل مل کر پچھتاتے ہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے بندہ سیاحین پر جا رہا ہو تو ساتھ برف لے جانے کی تک ہی کیا ہے۔

اس نے ہماری اردو ٹھیک کرنے کا ذمہ بھی اپنے اوپر لے رکھا ہے لہذا بہت سارے الفاظ جو ہم آج تک غلط طریقے سے بولتے اور پڑھتے آئے ہیں اس کی کتابوں میں صحیح تلفظ اور درست ججوں کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں ایک لفظ کا استعمال بہت دلچسپ ہے۔ شروع شروع میں جب پہلا سفرنامہ پڑھا تو لفظ ”ادائیگی“ کی بجائے ”ادائی“ پڑھ کر بے سائنتہ ہنسی آئی پھر اس کتاب میں اتنی ادائیاں آئیں کہ ہنسی کھلکھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن جب میں نے بے یقینی کی کیفیت میں لغت اٹھا کر دیکھی تو اپنے سارے قہقہے مجھے اپنے اوپر گونجتے محسوس ہونے لگے۔ میں ایسے غلط العام الفاظ کے دلیرانہ درست استعمال پر اسے رشک نما حسد سے دیکھتے ہوئے ہمارا کباد پیش کرتا ہوں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ادائی کے بے تحاشہ استعمال کے دوران اگر کاتب غلطی سے یا اپنی علمیت کو درست سمجھتے ہوئے الف اڑا دیتا تو یہ سفرنامہ زچہ پچہ

وارڈ بن کر رہ جاتا۔ لیکن اللہ نے داؤد طاہر کو بڑی عزت دے کر اس شرمندگی سے بچا لیا ہے۔

ہمارے دوست کو جہاں اتنی خوبیوں سے نوازا گیا ہے وہاں دو چار خامیاں بھی ہیں مثلاً وہ جھوٹ نہیں بولتا وہ اپنی سادگی کو عیاری کے بھیس میں نہیں چھپاتا۔ سفر کے دوران کہیں اسے کسی چیز کا یا کسی مشین کا استعمال نہ آئے تو بلا کم و کاست بیان کر دیتا ہے اور ایسی بے باکی کے ساتھ لکھ دیتا ہے کہ شرمندگی ہونے لگتی ہے کہ گورڈاس پور کا یہ پینڈو امریکہ کیا لینے چلا گیا تھا پھر اسے مغرب کی رنگینیوں میں کھو جانے کی بجائے اکثر و بیشتر وطن اور گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔ وطن عزیز کے دکھوں پر کڑھتا ہے۔ دیار غیر میں ملک کا سفیر بن کر اس کا نام اونچا رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ مغربی اقوام کو ترقی کی منازل طے کرتے دیکھ کر اپنے دیس کیلئے بھی ایسے ہی خواب بننا شروع کر دیتا ہے۔ ملک کا وقار بلند کرنے کیلئے دوسری اقوام کے لوگوں کے سامنے پاکستانی قوم کی کیمیاں اور پسماندگیاں ارادتا "چھپا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ناقابل معافی جرم ہے لیکن چلیں جانے دیں۔ بڑا ہوگا تو سمجھ جائے گا۔ ابھی نیا ہے چھوٹا ادیب ہے بڑے ادیبوں کی طرح "لبرل" سوچ سے نابلد ہے آہستہ آہستہ شاید سب سمجھ سکے گا گو کہ اس کے "جینز" میں ایسے جڑوے نظر نہیں آتے۔

میرے اس خاکے سے داؤد طاہر کی محبت کی، اس کی وطن دوستی کی اور اس کے اجلے پن کی "ادائی" تو شاید نہ ہو سکے لیکن میں اتنا اعتراف ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا انسان، ایسا ادیب اور ایسا دوست کم کم دیکھنے میں آتا ہے اور آخری بات داؤد طاہر! تم داؤد بھی ہو، طاہر بھی ہو، تمہاری پارسائی پر کسے شبہ ہو سکتا ہے؟

کالا چٹا پیار، رؤف امیر



کالا چٹا پہاڑ

کہتے ہیں کہ ہر سال ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب سانپ میں اتنا زہر بھر جاتا ہے کہ وہ اس زہر کو باہر انڈیلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یوں کسی نہ کسی کو ڈس لیتا ہے۔ یہی حالت خاکہ نگار کی ہوتی ہے کہ جیسے ہی کسی شاعر ادیب یا کسی اور اسی قسم کی مخلوق کی کوئی تخلیق منضہ شہود پر آتی ہے تو اس کا خاکی زہر اس شخصیت کو منتقل ہونے کے لئے ٹپکنے لگتا ہے یوں ساون کے پچھلے موسموں میں بظاہر اچھے بھلے دکھائی دینے والے کئی اصحاب کو میں بذات خود زہریلا بنا کر مطمئن ہو چکا ہوں۔ اس کے بعد سارا سال زہر اگلنے کا یہ فریضہ وہ خود انجام دیتے رہتے ہیں۔ اس بار الحمد للہ اطمینان یہ ہے کہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے گی اور انتقال زہر کا یہ مرحلہ بحسن و خوبی اس لئے طے ہو جائے گا کہ دریا اس مرتبہ سمندر میں گر رہا ہے۔

صاحبو! خطہ پوٹھوہار کے مشہور و معروف کالا چٹا پہاڑ سے تو آپ بخوبی واقف ہونگے جو صرف اسی لئے مشہور نہیں ہے کہ اس کی رنگت کے اجزائے ترکیبی سفیدی اور سیاہی پر مشتمل ہیں بلکہ اس کی وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ وہ ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سر نکالے کھڑا ہے اور راستہ بھول جانے والوں کو منزل کا تعین کرنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھیے کہ وہی کالا چٹا پہاڑ کہیں اپنا رؤف امیر ہی تو نہیں ہے۔ صورتوں کی یہ مشابہت اتفاق سے نہیں ہے میرا دوست

رؤف امیر اسی پہاڑ کا باسی ہے بلکہ اپنی ہیئت اور مختلف صفات میں اس پہاڑ کی فوٹو کاپی بھی ہے لہذا میں اپنے خاکے کو اسی پہاڑ کے نام معنون کرتا ہوں۔ آپ رؤف امیر کے فن سے تو واقف ہو ہی چکے ہونگے مگر اس گوہر یکتا کی نمود کے لئے کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ پاکستان آرڈیننس فیکٹری کے سائے تلے مگر اس کی انتظامیہ سے بالا بالا یہاں ایک اور فیکٹری بھی اپنا کام کر رہی ہے اور وہ یہ شعروں کی فیکٹری ہے جو نہ صرف دھڑا دھڑا شعر سازی میں مصروف ہے بلکہ نہایت جدید اور نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق مال تیار کر کے دے رہی ہے جس کی تازہ ترین کھپ ”درنیم وا“ کی صورت میں موجود ہے یہ الگ بات ہے کہ اسے دیکھ کر حالی کا یہ شعر بے طرح یاد آنے لگتا ہے۔

مال ہے نایاب لیکن گاہک اکثر بے خبر
شر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ

رؤف امیر صرف شاعری میں ہی بلند آہنگ نہیں رکھتا خیر سے آواز بھی صور اسرافیل سے کم نہیں۔ جب وہ آواز کی تمام تر دھمک کے ساتھ ”صریر خامہ“ کے تنقیدی اجلاسوں میں گفتگو کرتا ہے تو غالب، شیفٹہ، اور اقبال بھی قبروں سے اٹھ کر جھٹ اپنے اپنے نامہ اعمال جھاڑنے لگتے ہیں کہ شاید ان کو پیش کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

جب وہ بولتا ہے تو صرف وہی بولتا ہے دوسرے تمام لوگ آواز اور علم کے آہنگ میں کمزور ساز کی طرح گھٹ کر رہ جاتے ہیں مگر ہوتا یوں ہے کہ ایسے میں وہ بعض اوقات اس ریلوے انجن کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے جو بے مقصد ریلوے کی پٹریوں پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر شٹنگ کرتا رہتا ہے اور اس بات سے قطعاً لا تعلق ہوتا ہے کہ پیچھے کم از کم ایک آدھ بوگی ہی لگالے۔ ویسے جب وہ صریر خامہ کے اجلاسوں میں آتا ہے تو ایک آدھ بوگی ہمیشہ لگا کے آتا ہے مگر اس کی بے محابا شٹنگ میں وہ بیچاری بوگیاں بہت جلد Shunt Out ہو جاتی ہیں اور اس کے تمام تر مربیانہ انداز کے باوصف وہ انہیں ریلوے کے افسران کیلئے وقف آراستہ سیلون سے زیادہ قد و قامت (Status) نہیں دے پاتا۔

رؤف امیر اپنا سلسلہ کلام کمال مہارت سے ٹوٹنے ہی نہیں دیتا۔ وہ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی بات یوں دھڑا دھڑا کرتا جاتا ہے جس طرح ہمارے مسلمان شادیاں کرتے ہیں۔ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ مخاطب غریب بھی اذن گویائی چاہتا ہے۔ وہ اذن مانگتا ہے اور یہ اذن دینے لگتا ہے وہ بولنے لگتا ہے تو یہ کھولنے لگتا ہے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو یہ اسے گستاخیتا ہے وہ جانا چاہتا ہے تو یہ اسے جاناں کہہ کر پھر بٹھا لیتا ہے اور اس وقت تک بٹھائے رکھتا ہے جب تک فریق ثانی کو گلو کوڑی کم از کم دو عدد بوتلوں کی حاجت محسوس نہ ہونے لگے یا جب تک وہ لوئی پانچہر کو آواز دینا شروع نہ کر دے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ وائرس بھی پھیلاتا ہے اور مسیحا بھی کرتا ہے جب وہ اپنی محبت بھری باتوں کی مرہم لگاتا ہے گرجوئی کے سپرٹ سے زخم دھوتا ہے اور خلوص کی پٹی باندھتا ہے تو کون کم بخت ہے جو پھر سے بیمار ہونے کے لئے بھلا چنگا نہ ہو جائے۔

موصوف کا ایک شعر ہے

تنہی سی اک مزاج میں ہے خوش دلی نہیں
وہ اس لئے کہ دل کو محبت ملی نہیں

پہلے مصرعے کی تشریح تو آپ اس سے قبل سن ہی چکے ہیں دوسرے مصرعے کی تشریح میں عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں چونکہ ایک دفعہ اس مصرعے کی شرح کی درخواست ہستی مذکور سے کرنے کا خطرہ مول لے چکا ہوں لہذا چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس جاں گسل مرحلے سے گزریں۔ زیادہ اس لئے نہیں کہوں گا کہ وہ آخر کو میرا دوست ہے اور دوست کے گندے کپڑے بازار میں بیٹھ کر دھونے کو دانشمندی نہیں کہتے کیونکہ اس سے کئی قسم کی قباحتیں پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور جو بسا اوقات خود اپنے حق میں ٹھیک نہیں ہوتا۔ صرف اس ضمن میں ایک لطیفہ آپ کو سناؤں گا۔ باقی آپ خود عاقل اور بالغ ہیں۔ ایک دفعہ ایک میراثی اپنے بیٹے کے لئے رشتہ مانگنے گاؤں کے سب سے بڑے چودھری کے ہاں چلا گیا۔ اس کے نتیجے میں جس صورتحال نے جنم لیا وہ کسی ذی شعور سے ڈھکی چھپی نہیں۔ چودھری نے اپنے شکرے بلوا کر میراثی کو خوب ”تونی“ لگوائی۔ جب خلیفہ صاحب خوب خدمت کروا

چکے تو چودھری کے لوگوں نے چھوڑ دیا۔ اوسان بحال ہوئے تو میراثی کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور جانے سے پہلے بولا۔ ”چودھری جی! سینوں فیر میں انکار ای سمجھاں؟“ امید ہے آپ اب تک اس شعر کی شان نزول کو بخوبی سمجھ چکے ہوں گے اور وہ جو مزاج میں تلخی ہے تو اس کی وجہ تک بھی آپ کے ذہن کی رسائی ہو چکی ہو گی۔

روؤف امیر خوش مزاج ہوتا ہے۔ وہ خوش خوراک ضرور ہے۔ جیب میں مرغ کڑا ہی کے لئے پیسے ہوں تو اس کو کسی نہ کسی دوست کے ہمراہ اس طرح کا مرغی کھانا کھانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خیال رہے کہ جیب کا اپنا ہونا شرط نہیں، کسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی شاعری میں جو عدو کا ذکر ہے تو وہ دراصل کھانا ہے جس سے وہ حسب توفیق خوب خوب نبرد آزما ہوتا ہے۔ اپنی اسی بسیار خوری کی عادت کی وجہ سے وہ پیٹ کی جملہ بیماریوں میں مبتلا بھی رہتا ہے مثلاً ”پیٹ کا ہلکا ہونا“ دوسروں کی شاعری دیکھ کر ”پیٹ میں مروڑ اٹھنا“ وغیرہ وغیرہ۔ اب ان بیماریوں کا علاج کرنے سے تو ڈاکٹر وحید احمد تک قاصر ہے۔

روؤف امیر عجیب شخصیت کا مالک ہے۔ وہ بیک وقت دوستی اور دشمنی نبھاتا ہے خوش فہم اتنا کہ ہونٹوں کے خم کو مسکراہٹ سمجھ بیٹھتا ہے۔ کسی کی منافقانہ ادا کو بھی اپنی سادگی میں دوستی سمجھ لیتا ہے اور نقد جاں تک ہار دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ غلط فہمی کا خیر سے یہ عالم ہے کہ دنیا کے تمام تیروں کا رخ اسے اپنی طرف مڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی اس عادت سے مجھے وہ سرواٹس کے مشہور کردار Don Quixotte کی طرح دکھائی دیتا ہے جو دور بھینٹوں کے ریوڑ سے گرد اڑتی دیکھ کر سمجھ بیٹھتا ہے کہ کوئی لشکر اس پر حملہ آور ہونے کو ہے اور یوں نیزہ لے کر معصوم بھینٹوں کو چیر ڈالتا ہے۔ یقین نہ آئے تو ”صریر خامہ“ میں اس کی ہدف شدہ بھینٹوں سے رابطہ کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنے راستے پر چلتے ہوئے صرف گرد اڑانے کی غلطی کی تھی۔

موصوف کو پیش گوئیاں کرنے میں بھی کمال حاصل ہے مثلاً اپنے ایک شعر میں

کہتے ہیں

امیر کس کو خبر تھی مری کہ یہ بچہ
ہوا ہوا تو بہت باشعور نکلے گا

ہمیں یقین ہے کہ جس روز یہ بچہ واقعی بڑا ہو گیا تو بہت باشعور ہو کر اس بستی سے نکلے گا اس کے بعد کیا ہوگا اس بارے میں ستارے ابھی خاموش ہیں۔

رؤف امیر بلا کا حافظہ رکھتا ہے لمبی لمبی نظمیں اور غزلیں اس کو زبانی یاد رہتی ہیں اور وقت آنے پر وہ طوطے کی طرح فوراً "فر فر" سنا دیتا ہے شرط صرف شعر کا معیاری ہونا ہے۔

سر کے بال صاف کروانے کی اس سے قبل صرف دو معروف وجوہات معلوم تھیں یا تو آپ تازہ تازہ حج کر کے آئے ہیں یا آپ نئے نئے پیدا ہوئے ہیں اور سنت پر عمل کرتے ہوئے آپ نے سر کے بال منڈوا لیے ہیں مگر اب دو نئی صورتیں بھی سامنے آئی ہیں۔ مکمل طور پر سر کے بال صاف ہوں تو یہ بھی شک کرنا چاہیے کہ آپ ایم فل کر رہے ہیں۔ رؤف امیر نے چونکہ ایم فل مکمل کر لیا ہے لہذا اس نے سر کے بالوں کو اجازت دے دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں اگ آئیں۔

رؤف اپنی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے "ایک ایک شعر کو کئی کئی مرتبہ قطع و برید کے عمل سے گزارا لاتعداد غزلیں نظمیں نذر آتش کیں (کاش یہ خوبصورت عمل جاری رہتا) سالہا سال تک قصر شعر کے دروازے پر دستک دی تب کہیں جا کر یہ در نیم وا ہوا" موصوف سے گزارش ہے کہ اگر چند غزلیں نذر آتش کرنے کے بعد یہ در نیم وا ہوا ہے تو اس در کو مکمل طور پر وا کرنے کے لئے مزید قربانی بھی دی جاسکتی تھی مگر سچ تو یہ ہے کہ اتنا سادہ بھی وا کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کہتے ہی لوگ ہیں جو متاع شعر کو کاندھے پر لاوے گلی گلی آواز لگا رہے ہیں ہر دروازے پر دستک دے رہے ہیں مگر کوئی دریچہ تک نہیں کھلتا یہ رؤف امیر ہی ہے جس کی ایک آواز پر قصر شعر نے اپنے دروازے کو نیم وا کر کے جھانکا ہے دوسری آواز پر یہ در مکمل طور پر وا ہو سکتا ہے اور چند اور آوازوں سے وہ اس قصر کی اہم ترین مسند بھی سنبھال سکتا ہے اور میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتا ہوں۔

"در نیم وا" کی پشت پر رؤف امیر کی ایک رنگین تصویر موجود ہے جو غالباً اس

کی سب سے خوبصورت تصویر ہے نیچے ایک شعر درج ہے

یہ آئینہ مجھے کس رخ پڑا نظر آیا
میں اپنی عمر سے کتنا بڑا نظر آیا

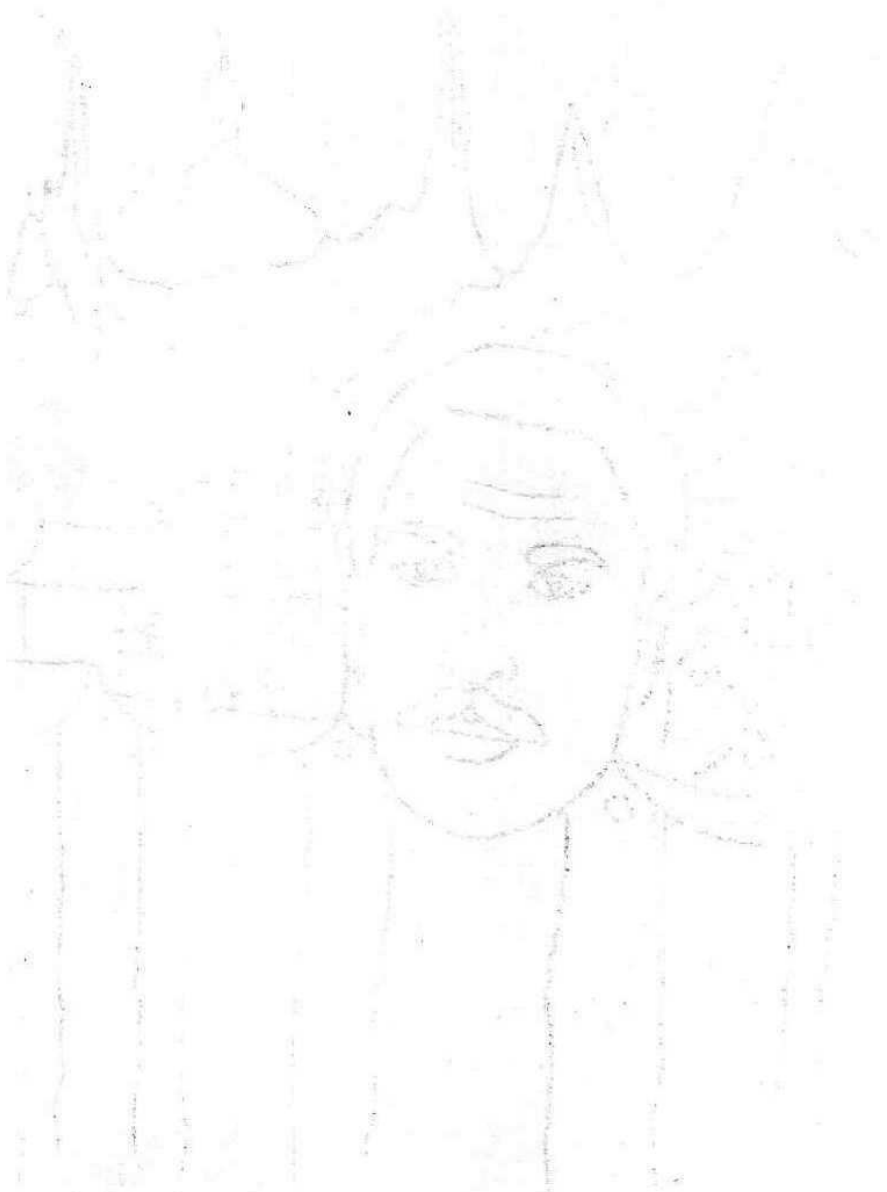
یہ شعر لکھنے کی ضرورت اسے کیوں پیش آئی اس کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سر میں جو خاکسری رنگ آپ کو نظر آ رہا ہے تو یہ خاک کی وجہ سے نہیں بلکہ چاک کی وجہ سے ہے۔ شاید آپ بھول رہے ہیں کہ اس کا پورا نام پروفیسر رؤف امیر ہے۔ ویسے آپ اسے بتا سکتے ہیں کہ طلباء کو سمجھانے کے لئے بلیک بورڈ کا استعمال زیادہ بہتر رہتا ہے۔ اسے یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ یہ آئینہ اسے ہی نہیں دوسروں کو بھی اس رخ پر پڑا نظر آیا ہے۔ آپ کو شاید حیرت ہوتی ہو کہ سبط علی صبا، راز مراد آبادی اور علامہ یوسف جبریل کی دوستی کا دم بھرنے والا رؤف امیر صرف ۳۸ سال کا کیسے ہو سکتا ہے تو جناب اکیسویں صدی سر پر ہے قرب قیامت کے سارے آثار تمام ہونے کو آئے ہیں اور اس حیرت کدے کے بہت سے دوسرے اسرار کون سا آپ کی سمجھ میں آ گئے ہیں لہذا اس کو خدا کی مرضی سمجھ کر صبر شکر کر لیں اور خاموش رہیں۔ خاموش رہنے سے یاد آیا کہ رؤف امیر کے سامنے یہ خاموشی بھی قیامت ڈھا سکتی ہے۔ ایک دفعہ میں ایک موقع پر خاموش رہ کر اس کی چھ ماہ کی ناراضی مول لے چکا ہوں جس کے بعد میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں کم از کم اس کا خاکہ نہیں لکھوں گا مگر اب اس نے خاکہ نہ لکھنے کی صورت میں ناراضگی کی دھمکی دے دی لہذا میری کیفیت اس وقت تیسری دنیا کے ان ممالک جیسی ہے جنہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ امریکہ ان سے کیسے خوش ہو سکتا ہے لیکن مجھے اس کی خوشنودی اس لئے بھی چاہیے کہ وہ میرا دوست ہے جب میں اسے دوست کہتا ہوں تو خدا جانے یہ مصرع ہمیشہ کہاں سے میرے ذہن میں آ جاتا ہے حالانکہ اس کے متن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

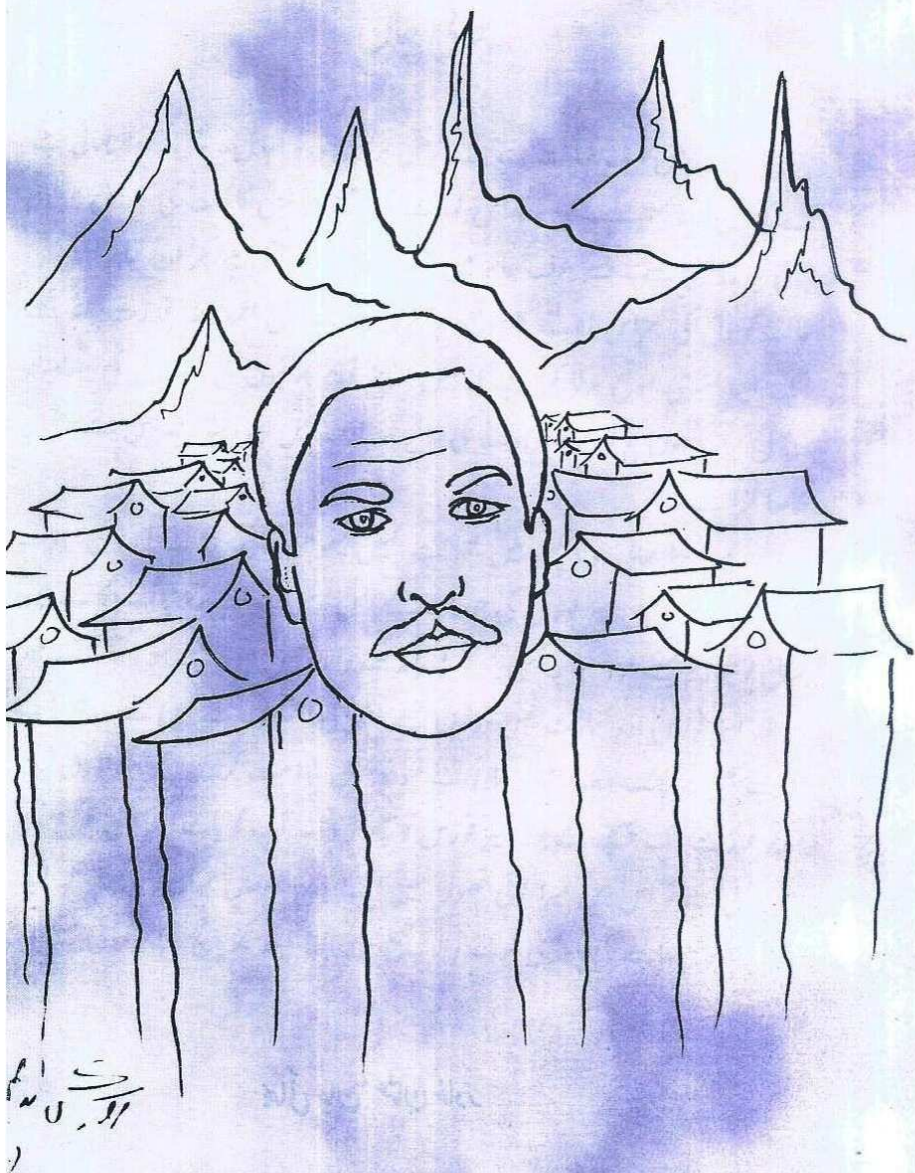
تو صاحبو! چھتے میں تو میں نے ہاتھ ڈال ہی دیا ہے اب لگے ہاتھوں شد بھی نکال لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے اور شد بھی وہ جو بالکل خالص ہے فطرت کی طرح۔ جنگل

کی طرح۔ کسی قسم کی ملاوٹ سے پاک۔ جس میں کسی کیمیکل کا کوئی دخل نہیں۔
روؤف کی شخصیت کا جو خاکہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس میں بھی کوئی
ملاوٹ نہیں۔ کوئی کیمیکل شامل نہیں کیا۔ اس کے باوجود اگر کوئی کیمیکل ایکشن ہو
جائے تو بندہ بشر ہوں خطا سرزد ہو سکتی ہے۔

جی بات یہ ہے کہ یہ رند نما درویش مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ جب شورش
کاشمیری کی طرح مست ہو کر سڑک پر چلتا ہے، پہلو بدل بدل کر تنقیدی جلسوں میں
گفتگو کرتا ہے، آواز کی گھن گرج کے ساتھ اپنی محبت اور نفرت کا اظہار کرتا ہے،
نہایت سادگی سے اپنی غربت اور نارسائی کا ذکر کرتا ہے اور واشگاف الفاظ میں دنیاے
رنگ و بو سے اپنی نا آشنائی کا اعلان کرتا ہے تو اس پر بے اختیار پیار آنے لگتا ہے۔
دامن دل اس کی طرف کھنچنے لگتا ہے اس کی ساری کٹافیں نظریں دھلنے لگتی ہیں۔
صرف اس کی محبت کی لطافت ہر سو چھا جاتی ہے۔ اس کی محبت شفاف جھرنے کی طرح
سب دوستوں کو سیراب کرتی ہے۔ پھر وہ ہر حال میں اچھا لگنے لگتا ہے چاہے وہ سر پر
استرا پھروا کر ہی کیوں نہ پھر رہا ہو۔ چاہے اس نے سر پر کاندھے کا کپڑا بڑے سے پکڑ
کی صورت میں کیوں نہ باندھ رکھا ہو اور چاہے وہ دس روپے کی انوٹسٹمنٹ سے
کاروبار شروع کرنے کے شاندار منصوبے کیوں نہ بنا رہا ہو۔ اس کے ساتھ چند دن
گزار کر دیکھیے آپ اس سے حیران تو ہو سکتے ہیں پریشان بھی ہو سکتے ہیں مگر اس سے
نفرت نہیں کر سکتے۔ اس کی شخصیت کے سحر سے نکل ہی نہیں سکتے آپ ہی ایمان
سے کہتے کہ سچے صاف اور کھرے انداز میں شعر کہنے والا اور ملنے والا شخص آپ کو
کیسے اچھا نہ لگے گا مگر اس کے لئے آپ کو اس کی اوپر کی سطح کو توڑ کر اندر والی سطح
تک آنا ہوگا یقین جانئے اتنا محبت کرنے والا، سیدھی بات کرنے والا، ریاکاری سے
بے دور کھڑا شخص آپ کو اور کہاں ملے گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا سادہ اور
ایماندار شخص اس دور میں زندہ کیسے ہے۔



بھائی جان، عثمان خاور



بھائی جان

فارسی میں ایک کہاوت ہے سگ باش برادر خورد مباش۔ یعنی چھوٹا بھائی بیٹے سے کتا بن جانا بہتر ہے۔ یوں تو اس کہاوت کی حقانیت اس کائنات کی ہر اس مظلوم ہستی پر روشن ہے۔ جسے عرف عام میں چھوٹا بھائی کہا جاتا ہے مگر ان تمام افتادگان خاک کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع کم کم ہی ملا ہے آج الحمد للہ قدرت نے مجھے ایک ایسا سنہری موقع عطا کیا ہے کہ میں اپنے تمام بھائیوں کی نمائندگی کی سعادت حاصل کر رہا ہوں چونکہ چھوٹا ہونے کی بنا پر حد ادب میں ہی رہنا ہے اس لئے امتحان خاصا کڑا ہے۔

میرا بڑا بھائی جو دیکھنے میں مجھ سے کہیں چھوٹا دکھائی دیتا ہے اس کی سمارٹ نیس کا راز دراصل ایئر فورس کی چودہ سالہ سروس ہے جسے اب وہ تیاگ چکا ہے چودہ سال یونیفارم پہننے اور کمر پر کس کر یلٹ باندھنے والا شخص موٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا چونکہ ایئر فورس اور سمارٹ نیس دونوں سے نظریاتی اختلاف ہے اس لئے دونوں کے قریب بھی نہ پھٹک سکا۔ عثمان خاور نے چودہ سال ملازمت کرنے اور سکواڈرن لیڈر کے عہدے تک پہنچنے کے بعد ایئر فورس کو چھوڑ دیا۔ آپ کو بات اگر الٹی طرح سمجھ میں آتی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ایک بات بہر حال حیران کن ہے کہ ایک طویل عرصہ ضابطے کی پابندی کرنے والا، صبح چار بجے اٹھ کر پانچ بجے وردی پہننے والا

اور طوعاً و کرہاً ہی سہی وقت کی پابندی کرنے والا فوجی بھی زندگی میں انتہائی مست کیوں ہے اس کی ایک معقول وجہ تو غالباً یہ ہے کہ سستی بہت اچھی چیز ہے لیکن ایک انتہائی غیر معقول وجہ یہ بھی ہے کہ جس شخص نے لمبی مدت لیفٹ رائٹ کرنے کے باوجود انتہائی ڈھٹائی سے شاعری جاری رکھی ہو اس کو سستی اور کاہلی کا تمنغہ سجانے کا پورا حق حاصل ہے تمنغوں سے یاد آیا کہ موصوف کو فوجی سروس کے دوران چند تمنغوں سے بھی نوازا گیا تھا جن میں تمنغہ خدمت، تمنغہ بسالت اور تمنغہ خجالت وغیرہ شامل تھے ظاہر ہے ہماری قوم کو ایسے ہی سوراووں کی ضرورت ہے لیکن آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ بہت سے تمنغے ہمارے بھائی نے جو فوجی کم اور شاعر زیادہ تھا محض ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے کوشش کر کے حاصل کیے ہیں۔

عثمان خاور کو پہلی نظر میں دیکھ کر انسان پر شرافت کا شدید دورہ پڑتا ہے وہ ملنے والوں پر اپنی شرافت کے دڑے برساتا ہے جب فریق ثانی نڈھال ہو جاتا ہے تو پھر اس پر اپنی محبت کا جال پھینکتا ہے اور اس طرح کس لیتا ہے کہ کسمانے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن بعض منجھوں کا کہنا ہے کہ اس کی مظلومیت کی سرحدوں سے ملتی ہوئی شرافت ہمارے ہاں کی ایک اقلیت کے وصف خاص سے مشابہہ ہے اس کی رنگت کی وجہ سے آپ کو اقلیت کے بارے میں بھی مغالطہ ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ آپ اس کے ڈانڈے صبح سویرے سڑکوں پر صفائی کرنے اور سیالکوٹی پنجابی مین باتیں کرنے والی قوم سے ملانا شروع کر دیں لیکن میری مراد اس اقلیت سے ہے جو نبوت کا سلسلہ دراز کرنے کے حق میں ہے لیکن اس شے کی نفی اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ فکر مودودی کا بہت بڑا حامی ہے اور جماعت اسلامی کا ہمدرد بھی ہے ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ بندہ جماعت اسلامی سے نکل جاتا ہے لیکن جماعت اسلامی اس میں سے نہیں نکلتی۔ ہمارے بھائی کی بھی ہڈیوں میں جماعت اسلامی اس طرح رچی ہوئی ہے کہ سفر نامے تک میں جھلکتی ہے۔ اس سفر نامے میں کمال احتیاط سے تمام غیر شرعی تفصیل سے گریز کیا گیا ہے مجھے چونکہ مصنف کا ہم سفر ہونے کا اعزاز حاصل ہے لہذا میں نے اپنی گناہگار آنکھوں سے جو ایمان شکن اور توبہ توڑ مناظر مصنف کی ہمراہی میں دیکھے تھے ان کی ہلکی سی جھلک بھی کتاب میں نہیں ملتی اور قاری بیچارا ایسی

انتظار میں پوری کتاب پڑھ ڈالتا ہے لیکن کیجئے ہمارے پورے سفر میں ہمیں کسی ماہ لقا نے دعوتِ ثواب یا دعوتِ نماز نہیں دی جب بھی کوئی دعوت ملی ہمارے ایمان زدہ قلوب بہر حال اسے قبول کرنے سے قاصر تھے۔ چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے مجھ تو یوں بھی بڑے بھائی کی ہاں میں ہاں ملانا تھی لہذا اب ذہن مطمئن اور دل آزر رہا ہے کہ میں بھی وہاں سے ایسے نکل آیا کہ ”دامنِ نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں“ یار لوگ میرے تاشقند میں پانچ روزہ اضافی قیام کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہتے ہیں مگر دس دنوں میں حسنِ فطرت ہریالی، مدرسے، مساجد اور خانقاہیں دیکھنے کی جو عادت پڑ گئی تھی اس سے کچھ ایسی اسلامی یونگ ہو چکی تھی کہ میں لاحول پڑھتا ہوا جہاز میں سوار ہو گیا۔

خاور صاحب شاعری بھی کرتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو اب تک ہو چکا ہو گا۔ ان کی شاعری بھی انہی کی طرح سنجیدہ اور کم گو ہے اسی لئے سال بھر میں ایک آدھ غزل ہی ہو پاتی ہے اور جو ہوتی ہے اسے سن کر اور پڑھ کر غزل کی تعریف مروجہ اردو تنقید کی بجائے ہشتی زیور کی روشنی میں کرنے کو جی چاہتا ہے ایک غیر مرئی سا محبوب ان کی شاعری میں کہیں کہیں دھند میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے جو محبت کا نام بھی آنے پر بدک اٹھتا ہے اور استغفر اللہ استغفر اللہ کا ورد شروع کر دیتا ہے نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے شاعر نے انتہائی مایوسی کے عالم میں نثری نظمیں لکھنا شروع کر دی ہیں جن کا مقصد غالباً سوائے احتجاج کے اور کچھ نہیں ہے کیونکہ عثمان خاور واقعی شاعر ہیں اور انہیں کسی نیم شاعرانہ مجبوری نے نثری نظم کی طرف مائل نہیں کیا۔

موصوف اتنی دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے انتہائی قریب بیٹھے ہوئے شخص کو بھی انہیں سننے کے لئے آلہ سماعت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے غالباً انہیں صرف بات کرنا مقصود ہوتا ہے، سنانا نہیں۔

طبیعت میں بلا کی احتیاط پائی ہے رات کو سونے سے پہلے گھر کے تمام دروازے کھڑکیاں اچھی طرح چیک کرنا ان کا دستور رہا ہے۔ بستر کی تمام شکنیں دور کیے بغیر ان کے نزدیک استراحت کا کوئی تصور نہیں صبح اٹھ کر جوتے نہایت غور سے دیکھ کر اور جھاڑ کر پہنتے ہیں گرمیوں کی راتوں کو کھلے آسمان تلے سفید چادری بچھا کر اور سفید مسہری

لگا کر سونا ان کو ہمیشہ سے بہت محبوب رہا ہے۔ اس طرح کا بہت سا آئیڈیل ازم ان کی زندگی میں رچا بسا ہے۔

عثمان خاور کی بعض عادتیں ایسی ہیں جنہیں ان سے جدا نہیں کیا جاسکتا انہیں وقفوں وقفوں سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی عادت ہے خواتین والے گھروں میں کھنکار کر داخل ہونا ماضی قریب میں شرفاء کا خاصہ رہا ہے موصوف چونکہ خاصہ شریف آدمی ہیں اس لئے مسلسل کھنکارنے کی عادت نے دامن ہنوز نہیں چھوڑا۔ بعض منچلوں کے نزدیک اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہیں خواتین والے گھروں میں جانے کا ایک طویل تجربہ ہے۔

فوج میں چاق و چوبند زندگی گزار چکنے کے باوجود خاور صاحب کی چال ڈھال گفتار اور اٹھک بیٹھک سے مخصوص قسم کی ”فوجداری“ چابکدستی نہیں جھلکتی کندھوں کو ڈھیلا چھوڑنے اور ایڑیاں گھیٹ کر چلنے میں جانے انہیں کیا مزا آتا ہے کہیں پر آگ لگ جائے۔ زلزلہ آجائے کوئی انتظار کے کرب سے گزر رہا ہو، یہ اپنے روایتی انداز میں مزے مزے سے ایڑیاں گھیٹتے ہوئے ہی پنچیں گے۔ چہرے پر ایک مخصوص نیم دلاویز اور نیم شکستہ مسکراہٹ ہوگی جو دراصل ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے یہی دھیماپن ان کی گفتگو سے بھی جھلکتا ہے غصہ آئے، پیار آئے، جھنجھلاہٹ ہو، جذبات کی یورش ہو ان کے بات کرنے اور اظہار کرنے کے قرینے وہی ہیں شاید اسی لئے بخارا کی لیلیٰ تاشقند جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئی تھی۔

خاور کے دوستوں کا حلقہ بہت محدود ہے۔ بہت ہی محدود۔ اس کے ایک یا دو قریبی دوست ہیں اور ان بیچاروں پر بھی قربت کی محض تہمت لگی ہے کیونکہ عثمان خاور کا اپنا کہنا ہے

اپنے تک محدود ہے میرے دل کا ہر اک راز

اس گنبد کے اندر گم ہے گنبد کی آواز

ہمارے سفرنامہ نگار نے پورا ازبکستان چھان مارا ہے جو انتہائی ریلے اور ڈالتے وار پھلوں میں اپنا ٹھکانہ نہیں رکھتا مگر انہیں پنجاب کے کھیتوں میں اگنے والا ساگ سب سے زیادہ مرغوب ہے اور یہ ان کی سب سے پسندیدہ ڈش ہے کھلا موسم ہو، دھوپ

نکلی ہو، آسمان صاف ہو اور ساگ کے ساتھ مٹی کی روٹی موجود ہو تو عثمان خاور کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا روشن دن میں لمبی سیر کرنا بھی ان کا محبوب مشغلہ ہے اس کے لئے موسم کی کوئی قید نہیں سردیوں کے ٹرم دن ہوں یا گرمیوں کی چلچلاتی دوپہرس، ان کی ایذا پسند جمالیات انہیں گھسیٹنے لئے پھرتی ہے مجھے ساتھ گھسنے کا خاصا تجربہ ہے مگر میری ”پنڈا رکھ“ طبیعت ان سے اکثر دامن چھڑا لیتی ہے ان کی یہی عادت دنیا کو ان کے لئے مشاہدہ گاہ بنا دیتی ہے اور وہ فطرت کو نذیر سے بچنے کی طرح دیکھتے ہیں مجھے یاد ہے بچپن میں جب ہم دونوں بھائی بیچ کی سیر کو نہر کے کنارے اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے تھے تو وہ میری نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو کان پکڑ پکڑ کر قدرتی مناظر دکھاتے تھے اور میں مجبوراً سب کچھ دیکھتا جاتا تھا۔

محبت، عثمان خاور کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف ہے مجھے اس ٹھنڈے میٹھے چشمے سے سیراب ہونے کے لاتعداد مواقع ملے ہیں جب بھی زندگی مجھ پہ نا مہربان ہوئی اور حالات کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چکا میرے بھائی کی محبت اور شفقت نے مجھ پر سایہ کر دیا۔ وہ تمام الجھنیں اور وہ تمام باتیں جو میں کسی سے نہ کہہ سکا اس سے کہہ ڈالیں۔ اپنی زندگی سے، دنیا سے، ارد گرد کے لوگوں سے مجھے جب بھی کوئی دکھ ملا اس شفیق ہستی نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس کی ذمہ دار طبیعت تلے میری غیر ذمہ داریاں اور میری کیمیاں چھپی رہیں میری خامیوں اور میری غلطیوں کو اس نے کبھی بے نقاب نہ ہونے دیا۔ زمانے کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر مجھے چلنا سکھایا اور سچ تو یہ ہے کہ میں آج بھی اس کی انگلی تھام کر چلتا ہوں مجھے آج بھی اپنے ہاتھ میں اس گے ہاتھ کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ زمانے کے گرم و سرد میں جب اس کی محبت یلغار کرتی ہے تو کسی تشکر آمیز لمحے میں میری آنکھوں کے گوشے بھگینے لگتے ہیں میں چاہوں بھی تو انی ٹائیوں، کرے اونز، رنگین پنسلوں، کھلونوں اور بوسوں کو نہیں بھلا سکتا جو اس نے میرے معصوم بچپن کا دل بھلانے کے لئے اور اپنی بے لوث اور سادہ محبت کے اظہار کے طور پر میری جھولی میں چپکے سے ڈال دیے تھے ان تمام تحفوں میں وہ قمینیس، پتلونیں، کوٹ اور نیکریں بھی شامل تھیں جو اسے چھوٹی ہو جانے کی وجہ سے مجھے مل جایا کرتی تھیں۔

آپ لیں گے میں اپنے بھائی کی تعریف کر رہا ہوں ایسا ہرگز نہیں ہے میں تو صرف محبت کی تعریف کر رہا ہوں میں تو خاکہ نگار ہوں حلقہ ارباب ذوق نہیں کہ محض خوبیاں یا محض خامیاں ہی گنواؤں ورنہ اپنے رؤف امیر کو جتنی پریاں قطار اندر قطار کتاب میں نظر آئی ہیں اس سے کئی گنا میرے بھائی کو تاشقند، سمرقند اور بخارا کی سڑکوں اور گلیوں میں نظر آئی تھیں اور جن کا ذکر ایمانداری سے کیا جاتا تو اس کتاب کا نام ”ہریالیوں کے دیس میں“ کی بجائے ”پریوں کے دیس میں“ ہوتا۔ مبلغ ۸۰ روپے کی کتاب میں محض پانچ روپے کے حصے میں ان میں سے ایک کا ذکر ہے اور وہ بھی کتاب کے اختتامی ابواب میں سے ایک میں اب اسے بے توفیتی نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے بقول یونیورسٹی کے دنوں میں ایک دفعہ اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک ساتھی کی رپورٹ ہو گئی کہ فلاں بھائی کسی لڑکی کے ساتھ فلم دیکھتے پائے گئے ہیں ان کی پیشی ہوئی سوال کیا گیا بھائی! سنا ہے کل آپ کسی بہن کے ساتھ فلم دیکھ رہے تھے بھائی نے جواب دیا فیصل آباد سے ایک عزیزہ آئی ہوئی تھیں گھر والوں کا اصرار تھا اس لئے مجبوراً ساتھ چلا گیا، ناظم صاحب نے کہا وہ تو ٹھیک ہے مگر جماعت کا نظم بھی کوئی چیز ہے اب بھائی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور کہا آپ نظم کی بات کرتے ہیں غزل بھی تو کوئی چیز ہے۔ تو بھائی عثمان خاور! شخصیت کا نظم اپنی جگہ مگر غزل بھی تو کوئی چیز ہے۔

میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں، غفور شاہ قاسم



میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں

بچپن میں ہم لوگ ایک نغمہ بڑے شوق سے سنا کرتے تھے ”میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں پر کام کرنا گا بڑے بڑے“ یہ نغمہ گاتے گاتے اور سنتے سنتے ہم بڑے ہو گئے مگر ہم سے کوئی بڑا کام سرزد نہ ہو سکا۔ تاہم ہمارے کئی دوست بڑے ہو کر چھوٹے چھوٹے کام ضرور کرنے لگے۔ یوں یہ نغمہ ماضی کے غلاف میں ملفوف ہو گیا۔ جب غفور شاہ قاسم نے کچھ عرصہ قبل اپنی کتاب مجھے دی تو یہی نغمہ کھٹ سے میری یادداشت کے کواڑ کھول کر باہر آگیا اور میرے لبوں پر ہلکورے لینے لگا کہ ”میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے“ بہر حال میں نے اسے لبوں سے پھسلنے سے بچا لیا کیونکہ میں نے غفور شاہ قاسم کا خاکہ لکھنا طے کر لیا تھا۔ وہ قرض نما قرض میں آج پورا کر رہا ہوں۔

غفور شاہ سے میری ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر اس مختصر سے شخص کو اس مختصر سے عرصے میں جاننا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اسے پہلی بار دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس شخص کا خاکہ لکھا جاسکتا ہے اور یوں میں نے اسے احساس دلائے بغیر نیٹ پر پبلش جاری رکھی۔ اس سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا رہا اور بالآخر آج براہ راست فائل میچ کھیل رہا ہوں۔

غفور شاہ قاسم کی کتاب پر چھپی ہوئی تصویر کو پہلی بار دیکھنے سے جانے کیوں

لگتا ہے کہ اس نے نیچے نیکر پن رکھی ہے۔ بہر حال اگر ایسا نہیں بھی ہے تو وہ دوست احباب کے کاتجھے ضرور اڑا لیتا ہے تاکہ شلوار کا کام لے سکے۔ سترپوشی کا اس سے عمدہ مظاہرہ کہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ شلوار قیض کے ساتھ وہ واسکٹ کا خاص اہتمام کرتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میانوالی کے گرم اور واہ کینٹ کے سرد موسم میں، میں نے اسے کبھی واسکٹ کے بغیر دیکھا ہو۔ حقیقت یہ ہے اس کی شخصیت کا مقدور بھر تاثر اسی واسکٹ کا مرہون منت ہے

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔

کتاب کی پشت پر غفور شاہ کی رنگین و غمگین تصویر کے ساتھ اس کا تعارف موجود ہے۔ ۲۱ اگست ۱۹۵۲ء کو پیدا ہو کر موصوف نے اپنے والدین کو شرمندگی کا ایک موقع فراہم کیا۔ میٹرک کا امتحان نمایاں پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ نمبر ۱ ڈویژن غالباً ”سہوا“ رہ گیا ہے ویسے بھی ”نمایاں پوزیشن“ لکھنے سے فائدہ یہ ہے کہ اس میں کافی مارجن ہوتا ہے۔ کسی شخص نے ایک نوجوان سے پوچھا برخوردار! کتنے بھائی ہو؟ برخوردار نے چھاتی پھیلا کر کہا ”چھ“۔ پوچھنے والے نے یہ کہہ کر نوجوان کی چھاتی پھر سکیر دی کہ سات ہوتے تو کیا کر لیتے۔ سو بھائیو! ہمارے غفور شاہ نے بھی تین ایم اے کئے ہیں اب آپ اس سے یہ مت کہئے گا کہ چار ایم اے کرتا تو پھر کیا کر لیتا۔ مگر آپ کے شریر چروں سے مجھے لگ رہا ہے کہ آپ اس سے یہ سوال ضرور کریں گے اور اگر آپ سوال کرنے پہ بضد ہیں تو اس سے یہ مت پوچھ بیٹھے گا کہ اس نے گھر دامادی کا تمغہ اپنے سینے پر کیوں سجایا ہے کیونکہ یہ اس کا نجی معاملہ ہے۔ ویسے فن کار تو پبلک پراپرٹی ہوتا ہے اس کا کوئی معاملہ نجی نہیں ہوتا۔

غفور شاہ کے زندگی کے بارے میں چند اپنے فلسفے ہیں مثلاً قرض حسہ کو وہ ”قرض ہنسنا“ سمجھتا ہے یعنی ایسا قرض جس کی واپسی کے مطالبے پر قرض دار ہنسنا شروع کر دے لہذا ایسے ”قرض ہنسنا“ وہ اکثر و بیشتر لیتا ہی رہتا ہے۔

کم خور کی کو دانش مندی سمجھتا ہے حالانکہ اس کے پچاس کلو کے جسم میں دانشمندی کی ایک چھٹانک بھی نہیں ہے۔ اگر اس کا فلسفہ صحیح ہوتا تو ہم جیسے خوش خوراک دانش کے قرب و جوار میں بھی نظر نہ آتے۔

غفور شاہ اپنے شاگردوں پر ہمیشہ دست شفقت رکھتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے اور ان کے علم کی پیاس بجھانے کیلئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ فرسٹ ایئر کے نو گرفتار ان کالج پر تو وہ خصوصی توجہ دیتا ہے اور تحصیل علم کی خاطر آئے ہوئے ان نو نمالان قوم کو قطرہ قطرہ سیراب کرتا رہتا ہے۔

سوڈا واٹر کی زور سے کھلنے والی بوتلیں غفور شاہ کو بہت مرغوب ہیں۔ بننے والی بوتل اس کو کہیں نظر آجائے تو فوراً اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ بوتل کا ذکر ہو اور وہ بھی ٹنک سے کھلنے والی تو نہ جانے کیوں جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور کی ٹنکی یاد آنے لگتی ہے۔ اگر غفور شاہ یہی شغل بکثرت اس دور میں کرتا تو اس کی کمر پر کیچنویس جیسے لاتعداد نشان ہوتے۔

غفور شاہ ہماری بھابی کے ہاتھ پر مکمل طور پر بیعت ہے۔ ”مرشد“ کے بتائے گئے تمام وظائف بڑی دلجمعی سے پورے کرتا ہے مگر کیا کیا جائے اس نانہار معاشرے کا۔ منہ ماری کے لاتعداد مواقع زبردستی فراہم کر کے ساری۔ تپسیا بھسم کر دیتا ہے۔ بہر حال وہ ہر جگہ اور ہر وقت مرشد کا ذکر کرنا نہیں بھولتا اور یوں ہر کسی کے سامنے مرشد کے درجات زیادہ اور اپنے کم کرتا رہتا ہے۔

ہمارا یہ دوست کبھی باد ہماری کے نغموں پر بہت سر دھنا کرتا تھا۔ جلت رنگ بجاتے جھرنوں کے سحر میں کھو جاتا تھا ہواؤں پر لکھے ہوئے پیغام پڑھتا تھا مگر ازدواجی مرشد کے ہاتھ پر بیعت ہونے کے بعد اکثر یہ شعر سناتا نظر آتا ہے۔

ایک بیوی ہے چار بچے ہیں
عشق جھوٹا ہے لوگ سچے ہیں

غفور شاہ مکمل طور پر نوکری پیشہ آدمی ہے ملازمت سرکاری ہو یا گھریلو دونوں میں بہت محتاط ہے اپنے پرنسپل سید محمد اکرم شاہ صاحب کا تذکرہ کرنا وہ ہر کس و ناکس کے سامنے نہیں بھولتا۔ تاہم یہ بتانا ہرگز ضروری نہیں کہ اس تذکرے کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ پرنسپل صاحب بھی ماشاء اللہ نابغہ روزگار شخصیت ہیں کچھ عرصہ قبل میانوالی میں منعقدہ ایک تقریب میں ان سے جو ملاقات ہوئی تھی وہ میرے ذہن پر آج تک نقش ہے۔ موصوف نے ہم سے نہایت محبت کا اظہار کیا تھا یہاں تک کہ جب

ہماری گاڑی واپسی کیلئے نکل رہی تھی تو شاہ صاحب نے ہم سے ملنے کیلئے ٹیلی ویژن کی ایک انگریزی فلم Chips کے پولیس والوں کی طرح اپنی موٹر سائیکل سکٹ کر کے ہماری گاڑی کے آگے روک دی۔ اگرچہ تیز آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی اور بارش بھی کچھ بوندے اور کچھ باندیاں برسا رہی تھی مگر شاہ صاحب نے اپنی قراقلی ٹوپی پر شاپنگ بیگ چڑھا کر بارش سے بچاؤ کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ بہر حال ہم ان کے اس تپاک سے بہت متاثر ہوئے۔ خدا ایسا افسر اور ایسا ماتحت ہر کسی کو دے۔ آپ چاہیں تو دعا میں حسب خواہش تبدیلی کر سکتے ہیں۔ میں بوجہ ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔

غفور شاہ کا سرائیکی لہجہ اس کی اردو اور چنی سی انگریزی میں بھی جھلکتا ہے لیکن وہ اس پر نہ تو شرمندہ ہے اور نہ ہی خائف۔ اسے اس پر فخر ہے میرے خیال میں اس قسم کی باتیں اس کا قد بلند کر دیتی ہیں۔

اردو انگریزی اور سیاسیات کا یہ ماہر میانوالی اور کنڈیاں کے طلباء اور طالبات کو ان تمام مضامین میں سرائیکی میں ”ٹووشن“ پڑھاتا ہے اگرچہ اس ٹووشن کے باعث کئی دفعہ اس کے تعلقات اپنی بیگم سے کشیدہ ہو چکے ہیں مگر صنف نازک کو پڑھائی جانے والی اس کی ”ٹووشنوں“ میں کوئی فرق نہیں آیا۔

غفور شاہ اصلاً اور سلاً ”سید“ ہے۔ اگرچہ بعض منجملے اس کے نام کے اس حصے کی تاریخ اجراء کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں مگر ان نامعقول لوگوں نے اصغر ندیم کو سید ہوتے ہوئے اور طارق عزیز کو شاعر ہوتے ہوئے پنجشم خود دیکھا ہے لہذا ان سے الجھنا فضول ہے۔

غفور شاہ میں بہت سے تضادات ہیں مثلاً فکر مودودی سے متاثر ہے مگر ذکر ریشم و نیلی اسے بہت مرغوب ہے۔ وعدہ خلافی کے بہت خلاف ہے مگر وعدے کرنے میں بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ کتاب ایک لکھتا ہے مگر اس کی تقریب رونمائی کی تاریخیں چار پانچ دفعہ بدلتا ہے۔ سر پر مختصر بال رکھتا ہے مگر بائیں آنکھ کی قاش کے انتہائی بائیں نکتے کو مرکز مان کر مانگ نکال لیتا ہے۔ چھوٹے قد کا مالک ہے مگر باتیں بڑی بڑی کرتا ہے۔ چھوٹے شہر میں رہتا ہے مگر بڑا آدمی ہے۔ حریص اور خود غرض معاشرے میں مقید ہے مگر بے لوث اور بے غرض محبت کرتا ہے۔ اس کے یہی

تضادات مجھے اس کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اس کے اندر محبت اور خلوص کا جو طاقتور مقناطیس فٹ ہے وہ مجھ جیسے کم مایہ لوہے کے معاشرے میں رہنے والے شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس کی بشری کمزوریاں درحقیقت اس کے انسان ہونے کی دلیل ہیں وہ جو ہے جیسا ہے ویسا نظر آتا ہے وہ ہونے اور نہ ہونے کی بیچ لٹکا ہوا نظر نہیں آتا۔ اسے اپنے ہونے کا ادراک ہے۔ اس کے ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے پاکستانی ادب پر ایک جامع کتاب تحریر فرمائی ہے۔

یہ کتاب بک ٹاک والوں نے غفور شاہ سے خصوصی درخواست پر لکھوائی ہے۔ غفور شاہ نے یہ کتاب کس سے لکھوائی ہے یہ علم مجھے قطعاً نہیں ہے ورنہ آپ کے گوش گزار ضرور کرتا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ اس کتاب کو خود پڑھیں یا کسی سے پڑھوا لیں۔ پڑھتے وقت اگر کتاب آپ کے ہاتھ سے گر پڑے یا کسی نادیدہ جذبے کے زیر اثر آپ خود پھینک دیں تو اس کا ذکر بہر حال مصنف سے ہرگز نہ کیجئے گا۔

آپ نے ایک لطیفہ سن رکھا ہوگا کہ دو اشخاص ایک گھوڑے پر سوار تھے۔ آگے والا سوار اطمینان سے سواری کرنے کی خاطر بار بار پیچھے بیٹھے ہوئے شخص سے پیچھے اور پیچھے ہونے کیلئے کہتا۔ پچھلا سوار سرکتے سرکتے گھوڑے کی دم کے قریب جا پہنچا۔ آگے والے سوار کے مزید اصرار پر اس نے احترام سے عرض کیا کہ ”بھائی جان! گھوڑا ختم ہو گیا ہے“ تو صاحبو! میں غفور شاہ پر لکھنا تو بہت چاہتا تھا مگر افسوس کہ...

آپي دهاپا، فاخره بتول



آپی دھاپا

کسی خاتون کا خاکہ لکھنا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ ایٹمی دھماکہ کرنا۔ ایٹمی دھماکہ کرنے سے پہلے جس طرح ہزار بار سوچنا پڑتا ہے چاروں اطراف میں فوڈ بھیجنے پڑتے ہیں رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے جتن کرنے پڑتے ہیں اور اس کے بعد جس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس طرح کے تابکاری اثرات پھیلتے ہیں اور جس طرح تنقید کا نشانہ بنا پڑتا ہے اس سے صرف دو شخصیات واقف ہیں اول الذکر میاں نواز شریف اور موخر الذکر یہ خاکسار۔ آپ یقین کریں کہ مجھے اس خاکے پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے بہت سے اندیشے لاحق تھے کیونکہ میں ایک ہاتھ اٹھانے والی خاتون کے خاکے پر ہاتھ چلا رہا تھا پھر عزت اور صحت کسے پیاری نہیں ہوتی۔ حمید شاہد نے کلٹن بن کر مجھے پانچ بار فون کر کے دھماکے سے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک مہربان لمحے نے مجھے یکدم وہ قوت اور ہمت بخش دی جو اس سے قبل صرف اٹل ہماری واجپائی اور میاں نواز شریف کو عطا ہوئی تھی۔

فاخرہ بوتل کو دیکھ کر آپ کو یہ گمان گزرتا ہوگا کہ اس کے ہاتھ اٹھانے کی بات میں نے مذاق میں کہی ہے ورنہ کہاں فاخرہ کہاں اس کا نازک سا ہاتھ اور کہاں بڑے بڑے شعراء و ادباء۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ فاخرہ بہت ”ہتھ چھٹ“ قسم کی شاعرہ ہے اور اس آپا دھاپی کے دور میں بھی اسے آپی دھاپا بننے کا وقت مل جاتا ہے اس کا

ثبوت اردو ادب کی ان بڑی اور معروف شخصیات کے گال ہیں جو کچھ طمانچوں کی ضرب سے اور کچھ شرم سے اب تک لال ہیں۔ آپ کو اگر پھر بھی یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لیجئے۔ انشاء اللہ مایوسی نہیں ہوگی۔

فاخرہ بتول کی شخصیت کا نمایاں پہلو اس کا اعتماد ہے جو کبھی کبھی کناروں سے باہر بھی چھلکنے لگتا ہے۔ وہ زن و مرد کی تمیز کے بغیر نہایت اعتماد سے تمام لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہے، بحث کر سکتی ہے، شعر سنا سکتی ہے، سن سکتی ہے۔ وہ بہت بے تکلف اور بولڈ ہے۔ اردو ادب اور اردو معاشرت میں اس سطح کی بولڈ خواتین کبھی کبھار دکھائی دے جاتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ فاخرہ کی بے تکلفی میں ایک اپنائیت ہے خلوص ہے جو اس کی شخصیت کی کوتاہی کو مزید کوئل کر دیتا ہے۔

وہ مہمان نواز ہے۔ دوست نواز ہے۔ ادب نواز ہے۔ اب آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ ستار نواز، سارنگی نواز اور طبلہ نواز بھی ہوگی۔ اس کا موسیقی کے ان آلات کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے جتنا اپنے حمید شاہد کو شاعری کے ساتھ ہے۔

توانا شاعری کرنے والی فاخرہ خود اتنی دھان پان سی ہے کہ آنکھیں مل مل کر دیکھنا پڑتا ہے کہ سامنے واقعی کوئی جیتا جاگتا انسان ہے یا صرف واہمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس مختصر نویسی کا اسے ایک فائدہ ضرور ہوگا کہ وہ ”پل صراط“ سے اتنی ہی آسانی سے گزر جائے گی جتنی آسانی سے میں موٹر وے سے گزر سکتا ہوں۔ اس کے بدلے جسم نے اس کو عمر چور بھی بنا دیا ہے ممکن ہے وہ رؤف امیر سے بھی آٹھ دس سال پہلے اس بے اعتبار دنیا میں وارد ہوئی ہو لیکن میں آپ کو اس کی عمر کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ کسی بھی خاتون سے خاص طور سے جب وہ غیر شادی شدہ بھی ہو اس کی عمر پوچھنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس طرح آپ کا اندازہ اور اس کی نیکیاں دونوں ضائع چلے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

مشاعروں اور ادبی محافل میں فاخرہ ایک منفرد انداز سے شعر پڑھتی ہے۔ اتنا سوز اس کی شاعری میں نہیں جتنا اپنے شعر پڑھتے وقت اس کے لہجے میں در آتا ہے۔ جب وہ اپنی طویل گردن ایک جانب لڑھکا کر غزل سناتی ہے تو جانے کیوں ایسا لگتا ہے

کہ آپ کسی ندی یا دریا کے ہموار ساحل پر قدرت کے نظارے دیکھ رہے ہیں۔ بسا اوقات تو اس جگہ اس انداز کے باعث سامعین پر اتنی رقت طاری ہو جاتی ہے کہ مجلس شام غریباں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اب اس کے احباب کو فکر یہ لاحق ہے کہ وہ شعر پڑھنے کا یہ فن کسی اور کو بھی سونپے گی یا نہیں۔ میری درخواست ہے کہ وہ رخسانہ نازی اور ماہ بیلا خاور کو کم سے کم ضرور فیضیاب کرے تاکہ اس کا یہ فن ہمیشہ زندہ رہ سکے اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

فاخرہ کے آبا و اجداد بخارا سے ہجرت کر کے سیدھا واہ کینٹ آئے تھے لیکن بعد میں راولپنڈی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ میں نے فاخرہ کا آبائی شہر دیکھ رکھا ہے۔ بخارا کے گلی کوچوں میں انگوروں کی بیلیں، شہتوت کے درخت اور ناشپاتی کے بیڑ اس طرح دورویہ سایہ کیے ہوئے ہیں کہ بیچ میں سے گزرتے ہوئے مشام جاں معطر ہو جاتے ہیں فاخرہ کی شخصیت سے اگر ان ہی پھلوں کی مہک آئے تو حیران ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر بخارا جانے والا مہک سکتا ہے تو بخارا کا رہنے والا کیوں نہ مہکے گا ہاں بخارا کی نسبت سے اس نے کچھ بخار بھی چڑھا رکھے ہیں جس کا نتیجہ آپ اس کی قابل رشک صحت کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک بخار اسے مکالماتی غزل کا بھی لاحق ہے عدیم ہاشمی نے اس مرض کا وائرس اتنا پھیلا دیا ہے کہ اس کے قرب و جوار میں بسنے والے اس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لہذا فاخرہ بتول مکالماتی غزلوں کا ایک مجموعہ جلد ہی منظر عام پر لانے والی ہے۔ آگے رام بھلی کرے گا۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ فاخرہ کا تعلق واہ سے بھی رہا ہے خوبانی اور لوکات کے درختوں، سبز رتوں اور مال کی زرد روشنیوں والے اس شہر خوش رنگ میں فاخرہ کا معصوم بچپن گزرا ہے جہاں وہ اپنی ہجولیوں کے ساتھ ننگے پاؤں کھیلا کرتی تھی۔ واہ کا نام آنے سے اس پر Nostalgia کا شدید دورہ پڑتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے اور جذبات میں ہيجان پیدا ہو جاتا ہے سچے کھرے اور محبت کرنے والے لوگوں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنے تلووں سے زیادہ دنوں تک مانوس رہنے والی مٹی کو اسی شدت سے یاد کرتے ہیں۔

فاخرہ پرائیویٹائزیشن کمیشن میں کام کرتی ہے۔ اب اس اطلاع کا یہ مطلب نہیں

کہ جن جن سرکاری اداروں کے ملازمین پرائیویٹائزیشن کے باعث گولڈن پنڈ شیک سلیم کا نشانہ بنے ہیں وہ سب ہماری اس بے ضرر سی شاعرہ کو اپنا دشمن مان لیں اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے محکمہ کیسوں کی فائلوں کو سنبھال کر رکھتی ہے اور نوٹ تیار کرتی ہے مسلسل لکھنے کے باعث اس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی زخمی ہو چکی ہے لیکن اس کی دفتری کارکردگی متاثر نہیں ہوئی بلکہ اس حد تک بڑھی ہے کہ اب پرائیویٹائزیشن کا عمل بھی شاعرانہ انداز میں اور شاعرانہ اصطلاحات میں مکمل ہوتا ہے۔ اس کی ان شاعرانہ کاوشوں کا شمر حکومتی سطح پر اتنا اوپر تک چلا گیا ہے کہ ہمارے وزیر اعظم بھی ”اے طائر لاہوتی“ والا شعر اپنے مخصوص کشمیری انداز میں کورس کی شکل میں قوم کو پڑھاتے نظر آتے ہیں۔

فاخرہ بتول کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اس کا پہلا شعری مجموعہ ”پلیکس بھگی بھگی سی“ حمید شاہد نے ”القلم“ کے زیر اہتمام اسلام آباد سے شائع کیا تھا جبکہ دوسرا مجموعہ ”چاند نے بادل اوڑھ لیا“ صفدر حسین نے ”الحمد“ کے زیر اہتمام لاہور سے شائع کیا ہے اگر یہی تیور رہے تو تیسرا مجموعہ کراچی سے اور چوتھا بھیرہ عرب میں..... لیکن ایسی نوبت ہی کیوں آئے۔ خدا کرے وہ اردو روزناموں کی طرح ایک شہر میں کامیاب اشاعت کے بعد دوسرے شہر پھر تیسرے پھر چوتھے اور پھر پانچویں شہر سے چھپتی رہے لیکن چھپتی نہ رہے کہ بعض اوقات لوگوں کو کتاب کی اشاعت کے بعد ایک، پھر دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پھر پانچویں شہر میں چھپنا پڑتا ہے کیونکہ منظر عام پر آنے سے زیادہ خوشگوار نتائج برآمد ہونے کی توقع ذرا کم ہوتی ہے۔ فاخرہ خوش قسمت ہے کہ وہ شہر شہر میں چھپنے کی بجائے شہر شہر سے چھپ رہی ہے۔

اس کی کتابوں کی پشت پر اس کی ایک رنگین تصویر ہوتی ہے۔ ویسے وہ رنگین تصویر شائع کروانے کا تکلف خواہ مخواہ کرتی ہے اس کی تصویر خواہ بلیک اینڈ وائٹ ہی کیوں نہ ہوتی اس نے رنگین ہی نظر آنا تھا کتاب والی تصویر میں وہ کسی شیمپو کا اشتہار دیتی ہوئی مشرق بعید کی کوئی ماڈل گرل دکھائی دیتی ہے اور یار دوست تو اشتہار دیکھ کر ہی شیمپو خرید لیتے ہیں بعد میں چاہے وہ امجد اسلام امجد ہی کیوں نہ بن جائیں۔

فاخرہ کی شاعری کا نمایاں وصف رومان ہے۔ غزل، نظم ہر جگہ ایک ہی جذبہ

شدود کے ساتھ جھلکتا دکھائی دیتا ہے ویسے تو اردو شاعری میں بالخصوص اور ادب میں بالعموم اس کیو پڈ دیوتا کی اقلیم جگمگ جگمگ کرتی نظر آتی ہے لیکن فاخرہ نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ یہ بہر حال نہیں کھل سکا کہ رومان کا جواز شاعری ہے یا شاعری کا جواز رومان ہے۔ نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ فاخرہ کا پورا نام فاخرہ بتول رومانی ہونا چاہئے تھا۔

فاخرہ کی شخصیت میں پارہ بھرا ہے۔ آرام سے بیٹھنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں اور کچھ نہیں تو پہلو ہی بدلتی رہتی ہے۔ اٹھتی ہے چلتی ہے فون سنتی ہے فون کرتی ہے کتاب لاتی ہے کتاب رکھنے جاتی ہے بڑے رسان سے شعروں پر داد دیتی ہے۔ ہر وقت متحرک ہر لحظہ مصروف۔ جانے کس جمود سے خوفزدہ ہے۔ بات بات پر ہنستی ہے مسکراتی ہے تہقے لگاتی ہے۔ پتہ نہیں کون سے دکھوں کو روکتے روکتے اس کے آنسو کھلکھلاہٹوں کی صورت میں بہہ نکلتے ہیں۔ فاخرہ بتول ایک سیدھی سادی لڑکی کا نام ہے چھوٹے سے بچے کی طرح وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش ہوتی ہے۔ خوشیوں کو تنلیوں کی طرح پکڑ لینا چاہتی ہے خوشبو کو عکس میں منتقل کرنا چاہتی ہے بڑا نظر آنے کے لئے ایڑیاں اوپر اٹھا لیتی ہے بڑوں کے جوتے پسین لیتی ہے اور نمود کی خواہش میں بہت آگے تک نکل جاتی ہے۔

میں نے اس پارہ صفت شخصیت کو پارہ پارہ جوڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اگر اس ماہ پارہ کا پارہ چڑھ گیا تو میرا خاکہ بھی پارہ پارہ ہو سکتا ہے لہذا گھبراہٹ میں یہ غریبی دعویٰ قبول کر لیں تو عنایت ہوگی کیونکہ بقول ظفر اقبال

یعنی الٹا ہی لکھ گیا ہوں
آپا دھاپی کو آپا دھاپا



شاه جنات، سید مبارک شاه



شاہ جنات

مبارک شاہ سے میری پہلی ملاقات چند برس پہلے ایک ادبی تقریب میں ہوئی۔ میرے ایک دوست نے ان کا تعارف اس طرح کروایا۔ یہ نسا "سید اور اصلا" مبارک شاہ ہیں مثلاً شاعر ہیں اور کسا "اکاؤنٹس کے محکمے میں افسر ہیں۔ تقریب ختم ہوئی تو موصوف نے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولے "آؤ میرے نال" ہم چند دوست ان کے گھر اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا پھر ایک دھماکے کے ساتھ بند کیا اور تمام دروازے بند کر چکنے کے بعد بیگم کو زور سے آواز دے کر کافی بنانے کیلئے کہا۔ میں ابھی تک سراسیمگی کی کیفیت میں تھا اور میرے اوسان ابھی تک بحال نہیں ہو سکے تھے کہ ان کا دو سالہ صاحبزادہ دروازے کو اسی زوردار دھماکے کے ساتھ کھول کر اندر داخل ہوا اپنے والد صاحب کی شان میں چند کلمات کہنے اور واپس چلا گیا۔ مبارک شاہ نے اٹھ کر مزید زور سے دروازہ بند کیا اور بولے "یہ بہت شرارتی ہے" پھر ایک چھوٹی سی شعری نشست ہوئی۔ مبارک شاہ نے اپنے شعر سنائے شروع کئے تو مجھے یوں لگا جیسے کھڑکیوں، دروازوں اور آوازوں کا شور ایک بتے ہوئے جھرنے کے شور میں دب گیا ہے جیسے صاف شفاف ٹھنڈا میٹھا پانی میری رگوں میں اتر گیا ہے جیسے اس مدو جزر سے میری ساری شخصیت زیر آب آگئی ہے۔ محبتوں کا یہ دریا اپنی تمام تر شدتوں اور جولانیوں کے

ساتھ بہتا رہا اور آج میری ذات کا ایک گوشہ بھی ایسا نہیں جسے میں اس کی محبت کے سمندر سے الگ تھلگ جزیرہ کہہ سکوں۔

مبارک شاہ کی ذات کے چند گوشے ایسے ہیں جنہیں آپ کے گوش گزار کرنا اس لئے ضروری ہے تاکہ اس کی شخصیت کے متعلق بھی آپ کو آگاہی ہو سکے کیونکہ مبارک شاہ کی شاعری بعض اوقات اتنی طاقتور ہو جاتی ہے کہ اس کی شخصیت اس میں دب کر رہ جاتی ہے اس ضمن میں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ جب میں نے مبارک شاہ کو یہ بتایا کہ اس کا شخصی خاکہ لکھوں گا تو اس نے یوں میرے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیے جس طرح دسمبر کے مہینے میں ماتحت اپنے افسروں کے گھروں کے چکر لگاتے ہیں۔ جب میں نے یہ خاکہ اس کو سنانے سے صاف انکار کر دیا تو اس نے ایک رکنی سنز بورڈ ڈاکٹر وحید احمد کی سربراہی میں قائم کیا لہذا اب اس کی تمام تر ذمہ داری سنز بورڈ پر ہے۔ سنز بورڈ کی بھی سن لیجے اس خاکے کو اچھی طرح کھگانے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ خاکہ سنز بورڈ کے مزاج اور معیار پر پورا نہیں اترتا یہ اسی صورت میں کلیننس حاصل کر سکتا ہے اگر اس میں چند خصائل اور اطوار مبارک شامل کئے جائیں۔ مثال کے طور پر شاہ صاحب کے ہاں پہلے شعر کی تخلیق کا واقعہ دروغ پر گردن ڈاکٹر وحید احمد۔

ایک دفعہ نصف شب کا عمل تھا واہ کی سڑکوں پر ویرانی کا عالم طاری تھا۔ ڈاکٹر وحید کو مبارک شاہ کا بلاوا آیا ڈاکٹر صاحب احتیاطاً اپنا فرسٹ ایڈ بکس ساتھ لیتے گئے۔ شاہ صاحب شدید گرمی کے عالم میں بھی ایک گرم چادر اوڑھے پسینے میں شرابور گھر کے ایک کمرے میں برا بھمان تھے۔ بے چینی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ چہرے کی رنگت ہر آن بدل رہی تھی۔ اضطراب کی کیفیت دیدنی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ بھانپتے ہوئے اور کچھ شہاتے ہوئے اس کیفیت کی وجہ پوچھی۔ شاہ صاحب نے کہا کہ تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ ایک تو تم ڈاکٹر ہو اور دوسرے تم شاعر ہو۔ تم اس مرحلے سے کئی بار گزر بھی چکے ہو لہذا اس گھڑی میرے پاس رہو۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً پیشہ و رانہ فرائض سنبھال لئے۔ شاہ صاحب کو تسلی دی اور بولے کہ تخلیق کا یہ کرب اگرچہ جاں گسل ہے مگر اللہ جلد کرم کر دے گا۔ خدا خدا کر کے جب کاپی

پر شعر ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے دیکھتے ہی نعرہ لگایا ”یہ تو ہو بہو غالب پر گیا ہے۔“
 خیر سے اس مرحلے سے گزرے تو اس نومولود کی مناسب دیکھ بھال کے لئے
 ذوق، غالب اور میر انیس کی کلیات نے آیا کے فرائض سنبھال لئے۔ کئی دفعہ آب و
 ہوا کی تبدیلی کے لئے دلی کے لال قلعے اور کوچہ بلی ماراں میں بھی لے جایا گیا ان
 پیچیدہ دلیلوں جیسی گلیوں سے گزرتے ہوئے کئی بار اس معصوم کی نگاہ رعایت لفظی
 اور مجاز مرسل پر پڑی مگر کم سنی کی وجہ سے آشنائی کے جرم سے باز رہا۔ یہ ننھا جب
 لڑکپن کی حدود سے گزر رہا تھا تو کئی بار تشبیہات و تراکیب سے آنکھ لڑی۔ کلاسیکی
 ادب کے محمل میں بیٹھی ہوئی لیلیٰ نے اس پر کئی بار نگاہ غلط انداز ڈالی عنفوان شباب
 کے تجربوں سے گزر کر جب یہ جوان رعنا بازار ادب میں نکلا تو اس کی مڈھ بھیڑ رؤف
 امیر سے ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا عروض اور تقطیع کی بھیڑ نے اس کا رنگ سنولانا شروع
 کر دیا۔ اساتذہ سے لے کر عہد حاضر تک کے شعراء رؤف امیر اور مبارک شاہ کے
 سامنے دست بستہ کھڑے اصلاح لیتے پائے گئے۔ یہاں تک کہ غالب کا اغلاط نامہ بھی
 تیار کیا گیا۔

مبارک شاہ کی ذات جتنی ہمہ جہت ہے اتنی دلچسپ بھی ہے۔ ان کے ماضی کے
 چند گوشے اگر بے نقاب کئے جائیں تو شاید بستان کا بھلا ہو۔ راوی کا بیاں ہے کہ
 موصوف بچپن میں قبلہ و کعبہ فلم سٹار رگیلا کے ساتھ کھیلا کرتے تھے انہی کے ساتھ
 پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ رگیلا صاحب نے ان کو مخاطب کر کے کئی مشہور فلمی نغمے
 بھی گائے مثلاً ”ٹھک ٹھک نہیں چل رہے بیلوا“ اپنی نگریا ہے دور“ وغیرہ وغیرہ۔ مگر
 ان کی زندگی کی ”وہی اک چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سوا ب بھی ہے“ خیر جب یہ
 دونوں بچپن کے دوست جوان ہوئے تو انہوں نے سوچا کہ مختلف شعبوں کا انتخاب کیا
 جانا چاہیے۔ قرعہ ڈالا گیا تو رگیلا کی قسمت میں شاعر بننا قرار پایا اور مبارک شاہ کو
 مستقبل کا مہمان مزاحیہ اداکار ٹھہرا دیا گیا مگر مبارک شاہ ضد کر بیٹھے کہ نہیں میں شاعر
 بنوں گا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ رگیلا مسخروں کی اداکاری کریں گے اور
 مبارک شاہ ڈبل رول کریں گے۔ ان برادران کی فلم ”کوڈے شاہ“ ان دونوں کی
 مشترکہ کاوش ہے۔

مبارک شاہ رنگیلا کی طرح Unpredictable ہے۔ انتہائی غیر متوقع طور پر کوئی ایسی حرکت ضرور سرزد ہو جاتی ہے جس سے موصوف پر اپنے پیرو مرشد کا رنگ نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ ابھی کچھ روز پہلے کی بات ہے کہ شاہ صاحب میرے پاس آئے۔ بیٹھتے ہی بولے ”یہ زندگی کیا چیز ہے یہ ہمارے ساتھ کیا مذاق کر رہی ہے“ میں نے یہ سوال سن کر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا۔ تھوڑا کھنکار کر گلا صاف کیا۔ بائیں ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھی نہایت مدبرانہ انداز سے ابھی تمہید ہی باندھی تھی ”شاہ صاحب بات کچھ یوں ہے کہ....“ اتنے میں شاہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے ”اچھا فیر میں چلناں“ میرا تمام فلسفہ گلے میں ہی اٹک گیا اور میں مہموت ہو کر انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔

شاہ صاحب کے اس دنیا کو سعادت بخشے کے بارے میں بھی ایک روایت ہے کہ جب تمام روہیں تخلیق ہو چکیں اور ان کو اجسام میں پھونکنے کا مرحلہ آیا تو یہ کھلا کہ شاہ صاحب کی روح دراصل خاکی جسم میں نہیں بلکہ ناری جسم میں پھونکی جائے گی۔ شاہ صاحب نے اپنی PR سے کام لیتے ہوئے Establishment Division سے اپنا کیس نکلوایا اور آخر کار طے پایا کہ روح تو جنت والی ہی رہے گی مگر جسم انسانی دے دیا جائے گا۔ لہذا ”جیسا ہے جہاں ہے“ کی بنیاد پر اس فانی دنیا میں لے لیا گیا۔

شاہ جی نے ایک کاروبار دل مجبور کو تقویت دینے کے لئے شروع کر رکھا ہے ماہی گیری اور گس بانی پر غور و خوض کے بعد مرغ بانی پر دل ٹھہر گیا۔ لہذا فوری طور پر یہ اہتمام شروع ہو گیا۔ پھر دل وحشی نے ایک پلٹا کھایا اور سوچا گیا کہ لیٹر کا کاروبار کیا جائے تاکہ مملکت خدا واد پاکستان کی واحد اسلحہ ساز فیکٹری کے جیالوں کو وافر مقدار میں منگے داموں انڈے سپلائی کئے جائیں۔ جب یہ طے پا گیا تو چوزوں کی خرید کا مرحلہ درپیش ہوا۔ فروخت کرنے والوں نے اپنی معذوری ظاہر کی کہ وہ مادہ چوزوں کی تخصیص نہیں کر سکتے چنانچہ مبارک شاہ نے یہ طریقہ نکالا کہ فی الفور اپنی کتاب ”جنگل گمان کے“ کھولی۔ انتہائی رومان انگیز نظم ”کافغان کی ایک شام“ چوزوں کو سنانا شروع کر دی۔ جن چوزوں نے یہ نظم سن کر اپنی گردنیں ایک طرف لٹکا دیں شاہ صاحب نے ان کو حیا کا فتویٰ دے کر مادہ قرار دیا اور لے آئے۔ اب موصوف اکثر

اپنے فارم پر جاتے ہیں اور جب غم زمانہ سے دل زیادہ پریشان ہوتا ہے تو آپ چوزوں سے لپٹ لپٹ کر روتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جوان ہونے والی تمام مرغیاں شاعرانہ مزاج رکھتی ہیں اور انڈے موڈ سے دیتی ہیں۔

سید مبارک شاہ کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف شاعری میں بلند آہنگ سے نوازا ہے بلکہ یہ بلند آہنگ ان کی آواز میں بھی ہے دھیمپن نہ مزاج میں ہے نہ آواز میں۔ دھیمی آواز ان کے نزدیک ضعف کی علامت ہے۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے جیسے سائیکل پر ٹرک کا ہارن فٹ کر دیا گیا ہے۔

ان کا ولی عہد بھی ماشاء اللہ انہی پر گیا ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ لگتا ہے کہ ایک نیا مبارک شاہ بہت جلد اس نگار خانے میں اپنی entry ڈالنے والا ہے۔ خدا اس بچے کو عمر خضر عطا فرمائے اس بچے کے علاج کے سلسلہ میں شاہ صاحب ایک دفعہ سلطنت برطانیہ بھی جا چکے ہیں۔ تب سے شاہ صاحب اپنے آپ کو بین الاقوامی شخصیت کہتے ہیں۔

دوستوں کا خیال ہے کہ دنیا کی کم از کم دو ہستیاں شاہ صاحب کے طفیل ضرور جنت میں جائیں گی۔ ایک تو ان کی والدہ محترمہ جنہوں نے ان کو جنم دیا پالا پوسا اور اتنا بڑا کر دیا دوسری ہماری بھابھی صاحبہ جنہوں نے ان کو اب تک برواشت کر رکھا ہے۔ خدا کرے ان کا حوصلہ کسی پل ماند نہ پڑے۔ یہ ہمیں جانتے ہیں کہ ہمارے اس دوست کی شیرازہ بندی میں ہماری بھابھی کا کتنا بڑا کردار ہے۔ یہ پارہ صفت شخص اپنی بے قرار طبیعت سے آگاہ ہے اور اکثر اوقات جوش جذبات میں اپنی اہلیہ کو عظیم خاتون کے لقب سے نواز بیٹھتا ہے مگر اگلے ہی لمحے اسے اس بات کا گلہ ہونے لگتا ہے کہ فلاں جگہ سے میرا ٹیلی فون آیا میری بیگم نے سنا۔ اس لڑکی نے میری بیگم کو اپنا فون نمبر اور پتہ تک لکھوایا مگر اس ”عظیم خاتون“ نے لکھ کر پھاڑ دیا اور مجھے علم تک نہیں ہونے دیا۔ بھابھی بھی ان کی اس سیمابی طبیعت کو معروضی انداز سے دیکھتی ہیں۔

شاہ صاحب کا ایک طریق کار ہے کہ جب طبیعت شاعری پر مائل ہو یا تلی ہوئی ہو تو بیوی بچوں پر کڑی شرطیں عائد کر دیتے ہیں اکثر اوقات تو ان کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ بیگم کو جمعرات کی رات میکے روانہ کر دیا جائے تاکہ پوری دلجمعی اور

فراغت کے ساتھ شاعری سے دو دو ہاتھ کر سکیں۔ اگلی صبح اٹھتے ہیں تو کم از کم چھ عدد غزلیں ان کے آنگن میں چوزوں کی طرح گھوم پھر رہی ہوتی ہیں۔ یہ فوراً انہیں الفاظ کے ٹوکے میں چھپا لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان میں عروض کی بیماری رانی کھیت کی طرح پھیل جاتی ہے۔

جس طرح ہر شاعر کے چند مداح اور چند نقاد ہوتے ہیں اسی طرح شاہ صاحب بھی توصیف و تنقید کے مرحلوں سے گزرتے رہتے ہیں ابھی حال ہی میں ان کی کتاب چھپنے پر ان کو ایک صاحب نے یوں داد دی کہ ”شاہ صاحب آپ کی شاعری میں روانگی بہت ہے“ ایک صاحب نے لفافے پر یہ ایڈریس لکھا ”سید مبارک شاہ ذریعہ معاش۔ سول سروسز آف پاکستان ٹیلی فون نمبر فلاں فلاں لالہ زار کالونی راولپنڈی کو ملے“ بیچ میں ایک خط بھی تھا جس میں تحریر تھا ”میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے آپ نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق جو توصیفی اشعار لکھے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی آپ بہت بڑے اللہ والے ہیں حیرت ہے کہ سول سروسز میں بھی ایسے نیک لوگ موجود ہیں۔ تصویر دیکھ کر ایک بات ضرور کھلتی ہے کہ آپ کے چہرے پر داڑھی نہیں ہے بہر حال خدا کبھی نہ کبھی ضرور ہدایت دے گا“ والسلام۔

سچ تو یہ ہے کہ میرا دوست مبارک شاہ جتنا دلچسپ ہے اس سے بڑا شاعر ہے اور اس سے کہیں بڑا انسان ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے اس کی محبت ملی ہے ہم دونوں نے بے شمار ساعتیں ایک دوسرے کی معیت میں گزاری ہیں۔ کبھی روشن پر نور صبحوں میں، کبھی تپتی ہوئی دوپہروں میں، جب وہ میرے لئے ایک شجر سایہ دار ہوتا تھا، کبھی گرمیوں کی خوبصورت شاموں میں جب اس کا ساتھ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی مانند تھا، کبھی راتوں کو جب آسمان پر ستاروں کے بجرے تیر رہے ہوتے تو ہم دونوں بے شمار باتیں کرتے۔ سارے جہاں کی باتیں، ادب کی باتیں، سیاست کی باتیں، معاشرتی طبقات کی باتیں، معاشی عدم استحکام کی باتیں اور وہ باتیں بھی جو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ خدا کرے کہ اس دوستی کی چھاؤں گھنی رہے۔ اس کی خرگوش جیسی معصوم مسکراہٹ اسی طرح کھلی رہے۔ اس کے ماتھے پہ لکھا ہوا سچ اسی طرح دکھتا رہے۔ اس کی آواز کی کھڑا کھڑا ہٹ میرے کانوں میں رس گھولتی رہے اور اس کی شاعری کا شکوہ الفاظ اسی طرح جاہ و چشم کے ساتھ قائم و دائم رہے۔

گل باتیا، مستنصر حسین تارڑ



گل باتیا

پرانے وقتوں میں کسی قلمرو کا شہزادہ ملک شام یا ملک یمن کی سیاحت کو جاتا، گھومتا پھرتا، پانچ سات شرٹیں پوری کرتا، ایک آدھ شہزادی سے شادی کرتا اور واپس آکر کاروبار سلطنت میں اس طرح کھو جاتا کہ اسے سفرنامہ لکھنے کا خیال تک نہ آتا۔ یوں اس جیسے تمام شہزادوں کی روداد داستان الف لیل میں یکمشت سمو دی جاتی۔ ان کی دیکھا دیکھی لکشمی مینشن کا ایک شہزادہ بھی دور دراز کے ملکوں میں سیاحت کی خاطر جا پہنچا۔ خوب گھوما پھرا۔ مگر نگر کی شہزادیوں کے ساتھ باہمی دلچسپی کے امور طے کئے اور تین بار شرٹیں کر کے واپس آگیا۔ خوش قسمتی سے چلانے کے لئے کاروبار سلطنت موجود نہ تھا اس لئے گوالمنڈی لاہور میں بیجوں کا کاروبار سنبھال لیا۔ اس کے بیجوں سے اوروں کی پھلوریاں آباد ہوئیں یا نہیں مگر وہ خود ایک تناور درخت بنتا چلا گیا اور اب تو وہ ایک شجر سایہ دار ہے۔

”نکلے تری تلاش میں“ سے آغاز کرنے والا مستنصر حسین تارڑ جب ”راکھ“ تک پہنچا ہے تو وہ ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اب وہ اتنی اونچائی پر کھڑا ہے کہ اس کو دیکھنے کے لئے دستار سنبھالنی پڑتی ہے۔ ویسے تو اس کے ساتھ بات کرنے کے لئے بھی اپنی دستار کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ موصوف نے اپنی گفتگو کو کچھ اس طرح لشکار رکھا ہے کہ سننے والا چندھیا جاتا ہے۔ بات بات میں کٹ اور مزاح

اس کا طرہ امتیاز ہے۔ لہذا مخاطب کو علم بھی نہیں ہوتا اور نشر اپنا کام کر چکا ہوتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف اس کا فن گفتگو ہے۔ وہ صبح معنوں میں گل باتیا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو صرف وہی بولتا ہے دوسرا مبہوت ہو کر اس کی ضروری غیر ضروری گفتگو سنتا رہتا ہے۔ اس کے بولنے کے فن نے اسے پاکستان ٹیلی ویژن کی صبح کی نشریات کا اینکر پرسن بنا دیا۔ آٹھ سال تک اپنی لچھے دار گفتگو سے ٹی وی کے ناظرین کو پاگل بنائے رکھا۔ بچوں کا چاچا جی بن گیا۔ صبح کی نشریات کو اس نے ون مین شو میں بدل ڈالا۔ کمپیئرنگ کی دنیا میں جب اس نے انقلاب برپا کر دیا تو ٹی وی کے ارباب اختیار کو بھی انقلاب کی سوچھی، سوانہوں نے بسم اللہ مستنصر سے ہی کی۔ ٹی وی والوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ نئی نسل کو سامنے لانا چاہتے تھے اور اس طرح ہمارے دوست کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ اب جوان نہیں رہا۔ لیکن اس کی شخصیت کی محبوبیت کچھ اس طرح لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہے کہ لوگ اب بھی اس کی گھنگریالی زلف کے اسیر ہیں۔ اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے یا کہیں اور میں نے بار بار یہ منظر دیکھا ہے کہ لوگ اب بھی اس سے بات کرنے میں اس کو دیکھنے میں اور اس کی باتیں سننے میں ایک مسرت بھرا فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ اب بھی بچوں کا چاچا جی ہے مگر شاید ٹی وی کے ارباب اختیار کو رشتوں کی مہک اچھی نہیں لگتی۔

مستنصر پاکستان کے انتہائی زرخیز اور سرسبز خطے تحصیل پھالیہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے اس پر فخر ہے۔ اس بھاگ بھری مٹی کی خوشبو میرے اندر بھی رچی بسی ہے کیونکہ خوش قسمتی سے میرا تعلق بھی اس علاقے سے ہے جہاں میرے بزرگوں کی حڈیاں دفن ہیں۔ یوں میں مستنصر کا گرائیں بھی ہوں۔ یہ علاقہ جہاں اپنی لہلہاتے کھیتوں اور خوبصورت لینڈ سکیپ کی وجہ سے مشہور ہے، وہاں خاندانی دشمنیوں اور زمینی جھگڑوں کے باعث خطرناک بھی ہے۔ گو کہ مستنصر نے ایک عرصہ قبل اپنی جان بچانے کی خاطر لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی مگر اس کے اندر دشمنی نبھانے کی روایت اب بھی موجود ہے یقین نہ آئے تو عدیم ہاشمی سے تصدیق کی جاسکتی ہے۔

مستنصر کو Son of the soil ہونے کا بھی فخر حاصل ہے غالباً اسی لئے سیدوں، قریشیوں، ہاشمیوں اور جعفریوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لہذا ”مردوں“ سے دوستی کرتے وقت وہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ دوست کا تعلق اسی مٹی سے پھوٹنے والی کسی ذات سے ہو، ہاں دوسری صنف کے ساتھ معاملات میں وہ خاصا روشن خیال ہے اور ایسے میں اس کے اندر کا تارڑ دبک جاتا ہے اور نہایت رو میٹک سا مستنصر انتہائی شائستگی کے ساتھ کسی چھپی، ربیکا، پاسکل، کرٹائن، سویٹی یا کیوٹی کے ساتھ بے دھڑک گھل مل جاتا ہے اور ہیلو، ہائے کرتا نظر آتا ہے۔

ذات کے علاوہ بھی مستنصر حسین تارڑ نے چند بغض پال رکھے ہیں مثلاً اسے شاعری سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ بعض منہ زور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ عناد دراصل اس کیپلیکس کا رد عمل ہے جو اسے شاعری جیسی لطیف شے کے سمجھ میں نہ آنے سے ہوتا ہے۔ لہذا وہ شاعروں سے دوستی اور شاعری سے دشمنی میں کمال رکھتا ہے۔ یوں بھی لسی پینے والے، سہا بن پال اور رٹل کے میلوں میں ہجڑوں کا ناچ دیکھنے والے اور گوانڈی کے کسان بیچ سٹور پر بیٹھے والے مستنصر حسین تارڑ کی صریح خامہ اگر نوائے سروش نہیں بن سکتی تو کسی کو کیا تکلیف ہے وہ نثر سے روٹی کما رہا ہے اور شاعروں سے بہتر کما رہا ہے۔ اس کثیف دور میں شاعری کی لطافت سے پیٹ نہیں بھرتا بس یہ بات شاعروں کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

ایک عجیب و غریب اور نقاوت بھرا تعصب وہ اردو کے خلاف اور پنجابی کے حق میں بھی رکھتا ہے۔ وہ عموماً لکھتا اردو میں ہے جو ظاہر ہے زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچنے کے لئے اس کی مجبوری ہے۔ ٹی وی پر اور تقریبات میں بھی اردو میں گفتگو کرتا ہے مگر ان سب کے علاوہ نہ صرف اردو میں بات کرنے سے اجتناب کرتا ہے بلکہ اردو کے خلاف بات کرنے سے بھی اجتناب نہیں کرتا۔ اس کا بس چلے تو اردو کو دہلی اور لکھنؤ کے مشاعروں سے باہر نہ نکلنے دے لیکن زبان کا کوئی جغرافیہ نہیں ہوتا اور اس کے پھیلاؤ کو روکنا اس کے کیا استاد امام دین کے بس کی بھی بات نہیں۔

مستنصر حسین تارڑ میں ایک معصوم سی خود پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اپنی نثر، اپنی زبان، اپنے لہجے، اپنے ڈرامے، اپنی ایکٹنگ، اپنے علاقے، اپنے

گھر اور اپنی ناک کے آگے اسے کچھ کم ہی نظر آتا ہے۔ خدا جانے بیرون ملک سفر کے دوران لڑکیاں کیسے نظر آ جاتی ہیں وہ بھی اتنی بڑی تعداد میں۔ یہ بات بعض ہٹ دھرم نقادوں کے نزدیک ہنوز تفسیہ طلب ہے کہ یہ تمام لڑکیاں واقعی مستنصر کو نظر آئی تھیں یا صرف قارئین نے دیکھی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی (جنہیں اپنے بارے میں بھی خاصی غلط فہمی ہے) بتاتے ہیں کہ یورپ کے کسی ملک میں ایک بس کے سفر کے دوران ایک لڑکی ان کے ساتھ سیٹ پر براہمن تھی سفر طویل ہو گیا تو لڑکی نے سستانے کی خاطر اپنے سر کو ان کے کندھے پر رکھ دیا۔ قاسمی صاحب نے فوراً لڑکی کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا ”بی بی! سیدھی ہو کر بیٹھو تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میرا نام مستنصر حسین تارڑ نہیں عطاء الحق قاسمی ہے۔“ ویسے تارڑ صاحب کو ایسی باتوں سے دل اور میدان نہیں چھوڑنا چاہیے اور ابھی عشق کے اور امتحانات میں باقاعدہ بیٹھنے کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے۔

آج سے کئی برس پیشتر ہمارے اس Jack of all trades دوست نے پاکستان ٹیلیوژن کے ڈراموں میں ایکٹنگ بھی کی ہے اس کے اپنے خیال میں تو وہ ٹی وی کا سب سے کامیاب اداکار رہا ہے لیکن غالباً ٹی وی کے ناظرین کا معیار اتنا نفیس نہ تھا کہ وہ خاموش ایکٹنگ سے استفادہ کر سکتے لہذا اس نے ایکٹنگ کو خیر باد کہہ دیا اور سکرپٹ رائٹنگ شروع کر دی۔ اس میدان میں اس نے اپنا لوہا منوایا لیکن اس کے لکھے ہوئے ڈراموں کی تعداد زیادہ نہیں اس کی وجہ خود اسے معلوم ہے یا پھر ان پروڈیوسروں کو جنہیں وہ پروڈکشن کی ٹیکنیک سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

مستنصر حسین تارڑ بعض اوقات ایک چھوٹا سا بچہ بھی دکھائی دیتا ہے اس کا معصومانہ خوف اس وقت عروج پر ہوتا ہے جب وہ سفر کر رہا ہو دراصل وہ موت سے ڈرتا ہے اور بے تحاشہ ڈرتا ہے۔ سڑک کا سفر اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے اور وہ ڈرائیور کو ڈانٹ ڈانٹ کر اور اچھل اچھل کر گاڑی آہستہ چلانے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ ٹرین میں چونکہ ڈرائیور اس کی آواز اور ڈانٹ سے بہت دور بیٹھتا ہے اس لئے وہ اپنے کپارٹمنٹ میں بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے اور گاڑی کے کسی حصے کو پکڑ کر اور دونوں ٹانگیں سامنے والی سیٹ کے ساتھ ٹکا کر ٹرین کی رفتار اپنے تئیں کم کرنے

کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران بھی اس کی حالت کم و بیش ایسی ہی ہوتی ہے مگر پائلٹ کی سبک رفتاری اور اتر ہوٹس کی نرم گفتاری کے سبب وہ بیچ کی راہ نکال لیتا ہے یوں بھی اپنی قومی ائر لائن کے ذریعے سفر کے دوران ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں جہاز خراب ہونے کی صورت میں استاد سوار یوں کو نیچے اتار کر دھکا لگانے کا حکم صادر نہ کر دے۔

مستنصر حسین تارڑ کی وجہ شہرت اس کا نام بھی ہے۔ اگر اس کا نام اللہ دے زخمی یا عاشق حسین پر دیسی ہوتا تو شاید اسے اتنی شہرت نہ ملتی۔ اس کے مشکل نام نے بھی اسے بے شمار پریشان کن شہرت عطا کی ہے اسے ایک فائدہ اپنے نام کا یہ بھی ہے کہ اس کا چالان کبھی نہیں ہوا۔ لہذا اب کئی من چلے ٹریفک پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے پر اپنا نام مستنصر حسین تارڑ بتاتے ہیں اور یوں عزت اور پیسہ بچا کر چلے جاتے ہیں۔ ہماری اسی فیصد آبادی چونکہ ناخواندہ افراد پر مشتمل ہے اس لئے لوگوں کی کثیر تعداد اس کے نام لینے سے پہلے پانچ منٹ تک مس مس کرتی رہتی ہے پھر جب اس کے نام کے پہلے لفظ کے باقی حروف ادا کرنے کا لمحہ آتا ہے تو ایک ناقابلِ توجیہ ترتیب سامنے آتی ہے جس میں تن پہلے اور سر بعد میں آتا ہے یقین نہ آئے تو مستنصر کا نام ادا کر کے دیکھ لیجئے۔

ایک پبلک گھر ہونے کے ناتے اسے اپنے امیج کا بڑا خیال رہتا ہے۔ چاہے انتہائی مزاحیہ بات اس کے پیٹ میں گدگدی کر رہی ہو مگر وہ لوگوں کے سامنے کھل کر نہیں ہنسے گا۔ جو کالیاں کا تارڑ ہونے کے باوجود کھانا کھاتے ہوئے Manners کا خیال رکھے گا۔ انتہائی جلدی میں ہونے کے باوجود باوقار انداز میں چلنے کی کوشش کرے گا۔ کمر کے عین درمیان میں چاہے کتنی ہی خارش کیوں نہ ہو رہی ہو لبوں پر ایک کرب انگیز مسکراہٹ سجائے رکھے گا اور ہاتھ نہیں ہلائے گا اور کوئی مضمون چاہے کتنا ہی پسند کیوں نہ آ رہا ہو، سرعام کھل کر داد کبھی نہیں دے گا۔

مستنصر خاصا آزاد خیال شخص ہے۔ فلش لکھتے وقت چھوٹی موٹی گالیاں اور ہلکے گاڑھے جنسی مناظر سے اس کے مضبوط اعصاب اور Ethics پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کا اندازہ آپ کو اس کی تحریروں کے تدریجی مطالعے کے بعد ہو گیا ہو گا اگر

بھائی کا ایمان تازہ ہونے لے چک گیا ہو تو وہ ”راکھ“ کا مطالعہ کر لے یقیناً ”مایوسی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب سنگ میل والوں نے منی بیک گارنٹی کے ساتھ شائع کی ہے۔ اس ناول میں کرسٹائنوں اور بریگٹاؤں کے ایسے توبہ شکن اذکار موجود ہیں کہ شداہ کی جنت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ شنید ہے کہ بک سیلر اس کتاب کو کسی خفیہ شیلٹ میں چھپا کر رکھتے ہیں اور صرف اپنے مخصوص اور اعتبار والے گاہکوں کو ہی دیتے ہیں۔ مستنصر صرف آزاد خیال ہی نہیں آزاد منش اور آزاد رو بھی ہے۔ پابندی اس سے کوئی بھی برداشت نہیں ہوتی، چاہے حکومت نے ہی کیوں نہ لگا رکھی ہو چاہے اس پر کوڑوں اور قید کی سزا ہی کیوں نہ مقرر ہو۔

موسیقی مستنصر کی کمزوری ہے بشرطیکہ شازیہ خشک نغمہ سرا ہو۔ اس کے علاوہ اسے سب کچھ پھیکا پھیکا اور خشک سا لگتا ہے۔ طبیعت زیادہ اداس ہو تو ”قیض تیری کالی“ سے بھی کام چلا لیتا ہے لیکن شازیہ خشک کے چولی گگھرے کے ساتھ موسیقی کے سر تال اس پر زیادہ آسانی سے کھلتے ہیں۔

تارڑ ایک مجلسی آدمی ہے۔ تنہائی سے اس کی صرف اس وقت بنتی ہے جب وہ تخلیقی کام کر رہا ہو۔ عام حالات میں اسے لوگ اچھے، اور دوست بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ یاروں کا یار ہے اور دوستی نبھانے کا فن جانتا ہے اس کی دوستی ہے ہی اتنی خوبصورت کہ اس سے تعلق رکھنے والا آپلی آپ نکھرنے لگتا ہے۔ زندگی کے صحرا میں مستنصر کی قربت میرے جیسے درماندہ مسافر کیلئے نخلستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی محبت کا در نیم وا ہوتا ہے تو آپ غیر محسوس طریقے سے اس میں داخل ہو جاتے ہیں پھر آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ دروازہ باہر سے بھیڑ دیتا ہے۔ ظالم پھڑپھڑانے بھی نہیں دیتا۔ اس کے Ethics کچھ بھی ہوں۔ اس کے نظریات مجھ سے کتنے ہی متصادم کیوں نہ ہوں، شاعری سے جتنی بھی بیزاری کا اظہار کرے وہ میرا دوست ہے اور مجھے دل و جان سے عزیز ہے۔ میں اس کا مداح بھی ہوں اس کی تحریروں کو چوم چاٹ کر پڑھتا ہوں اور اسے اس کی تحریروں کو میں نے تب سے دل میں اتار رکھا ہے جب سے میں نے اس کا پہلا سفر نامہ ”نکلے تری تلاش میں“ اپنی کورس کی کتابوں میں چھپا کر پڑھا تھا اور ڈاکٹر بننے سے بال بال بچ گیا تھا۔ آپ کو میرے تو صیفی جملوں سے

ممکن ہے پنجابی کی وہ کماوت یاد آ رہی ہو جس میں ایک جانور کے چوروں کے ساتھ مل جانے کا تذکرہ ہے مگر میں نے صرف اپنے سچے محسوسات کو زبان دی ہے ویسے بھی چٹکیاں کاٹنے کے بعد بدن سہلا دینے سے درد محسوس نہیں ہوتا۔

مستنصر کے ناولوں میں قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین کی تحریروں سے اس کی وابستگی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اگرچہ ”راکھ“ جیسا ناول لکھ کر یکایک وہ بہت اوپر اٹھ گیا ہے لیکن اس نے اردو فکشن کی ان دو قد آور ہستیوں کو اپنا مرشد مان رکھا ہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ سب آخر میں راکھ ہو گیا ہے لیکن چھوڑیے لوگوں کے منہ لگنے سے فائدہ، لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو ناول میں آریائی اثرات کی ایک مثلث بنتی ہے۔ اس مثلث میں شامل ہو تو قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین ہیں مگر تیسرا کون ہے اس کا خود مستنصر کو علم نہیں بالکل اس سکھ سردار کی طرح جو لاہور کی سیر کو آیا اور تانگے پر بیٹھا۔ تانگے والے نے ترنگ میں آکر سردار جی کو ایک سوال داغ دیا کہ سردار جی! میرے گھر تین افراد ہیں ایک میری بیوی ہے ایک بچہ ہے بتائیں تیسرا کون ہے۔ سردار جی کی تمام تر داغی صلاحیتیں جواب دے گئیں اور انہوں نے ہار مان لی۔ تانگے والے نے کہا چھوڑیں سردار جی! تیسرا میں ہوں اور کون ہے۔ سردار جی اس کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے۔ واپس اپنے گاؤں پہنچے تو گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے یہی سوال کر دیا۔ پورا گاؤں چونکہ سرداروں پر مشتمل تھا لہذا درست جواب دینے سے قاصر رہا سردار جی نے طیش میں آکر کہا اوئے خالص! تیسرا وہ تانگے والا ہے اور کون ہے؟ تو صاحبو! اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ تیسرا کون ہے تو مستنصر کو ضرور بتا دیجئے گا۔



حسب منشا، محمد منشا یاد



حسبِ منشا

اگر کبھی آپ افسانے کی ملائمت، ڈرامے کی دلچسپی، افسری کا جلا ہوا بل، ماتحتی کی امنٹ بے چارگی، دیہات کی سادگی، اسلام آباد کی ڈپلومیسی اور دوستانہ بے تکلفی جیسی دیگر اشیاء کو تلو کے پانچ کلو کے خالی ڈبے میں ڈالیں اور اس کا ڈھکن اوپر سے بند کر کے اچھی طرح کھڑکائیں۔ پانچ منٹ تک یہی عمل دہرائیں۔ دو منٹ تک محبت اور انسان دوستی کی آنچ دیں۔ اب ڈھکنا اتار کر اس آمیزے کو باہر نکالیں۔ ملاحظہ فرمائیں منشا یاد تیار ہے۔

یہ وہی منشا یاد ہے جسے افسانے نے انگلی تھام کر چلنا سکھایا مگر جب اس نے سبک روی سے چلنا سیکھ لیا تو ہائی جمپ لگانے کے شوق میں ٹی وی اسٹیشن کی دیوار تک پھلانگ گیا۔ یوں ٹی وی ڈرامے سے اس کا ”بندھن“ اس قدر مضبوط ہو گیا کہ رفتہ رفتہ افسانے سے اس کی ”راہیں“ جدا ہوتی گئیں اور اب اس کا افسانہ ماڈرن ازم کے طلسم میں کھو جانے والی کسی ماں کے بچے کی طرح اسے نہایت بے بسی سے پکار رہا ہے۔ شاید کسی دن اس کی ممتا اس کی پکار سن لے اور دوسری شادی کے ہنگاموں سے فرصت پا کر پہلے بچے کو بھی پچکار لے۔

”منشا یاد پہلی نظر میں ”منشی یاد“ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تابعدار قسم کی کمپرسی اسے منشی نما کوئی چیز بنا دیتی ہے۔ چونکہ اس کی جسامت اور نام

کے حروف میں چھوٹی ”سی“ کا کہیں دخل نہیں اس لئے اس کو منشی کی بجائے منشا ہی کہا جاتا ہے۔

چہرہ مبارک کو غور سے دیکھنے، دیکھتے رہنے اور دیکھ چکنے کے بعد ایک بات کا حتمی طور پر تعین کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس کے چہرے پر آپ کی نظر دائیں کان اور دائیں آنکھ کے درمیان سے سفر کرنا شروع کرے اور ٹھوڑی کی طرف سے ”راس امید“ کا چکر کاٹی ہوئی بائیں کان اور بائیں آنکھ کے درمیان کے مقام تک پہنچے تو اس تمام راستے میں داڑھی یا داڑھی نما کسی چیز کے آثار ہرگز نظر نہیں آئیں گے۔ صرف بالائی ہونٹ کی بالائی سطح مرتفع پر موچھ نما کسی چیز کا شبابہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اس طرح الحمد للہ شیونگ کریم، برش اور ریزر کا خرچہ تو صاف بچ جاتا ہے۔ ہاں البتہ اس ”گپلو“ سے چہرے کے وسیع و عریض حدود اربعہ کے باعث صابن اور کریم وغیرہ کا خرچ واپڈا کے اضافی سرچارج والے بلوں کی طرح ٹھیک ٹھاک آتا ہے۔

کبھی کبھی تو وہ اپنے چہرے مہرے سے ایک بھرے پرے دیہاتی خاندان کی ”بے بے“ نظر آتا ہے جو گاؤں کے آبائی مکان کے صحن کے ایک کونے میں بنے ہوئے گرمائی باورچی خانے میں ہنڈیا کے پاس بیٹھ کر آنکھوں سے مٹا کی پھوار برسانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو اور ان کے بچوں کو آلو گوشت رکابیوں میں ڈال ڈال کر دینے میں مصروف ہو۔ ہاں البتہ اس کی آنکھوں پر جچی عینک اسے تھوڑی دیر کیلئے دانشوری کا تزکا لگا دیتی ہے مگر عینک اتار دینے کے بعد وہی شیخوپورے کا وہی محمد منشا نکل آتا ہے جس کی آواز میں گھر کے دودھ سے نکلے ہوئے مکھن کی ملائمت ہے۔

شیخوپورے کے محمد منشا نے اسلام آباد آکر ”یاد“ کا لائقہ مختلف وجوہات کی بنا پر ساتھ لگا لیا ہے ایک تو اس کے خیال میں اس طرح کی پن چھپ جاتا ہے اور ایک فن کارانہ یا ادیبانہ رنگ نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ دوسرے جوانی کے پر کیف دنوں میں وہ جسے عمر بھر ساتھ رکھنے کا خواہشمند تھا اسے ساتھ نہ رکھ سکے کے سانچے کے بعد اس کی یاد کو اس طرح لئے پھر رہا ہے کہ نام کا حصہ ہی بنا لیا ہے۔ تیسرے وہ اتنا درد مند واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کی منشا یاد رکھتا ہے اور ہر کام دوسروں کے حسب منشا کرتا ہے۔ مثلاً کہانی میں قاری کی، ڈرامے میں پروڈیوسر کی، دفتر میں افسر کی اور گھر میں بیوی کی منشا کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے اور فیض پاتا ہے۔ ویسے اس کی معصومیت

پر رونا بھی آتا ہے کہ وہ ایک ایسے شہر میں یاد کو ساتھ لگائے پھر رہا ہے جو اپنے نام کے ساتھ یاد کا ہم قافیہ لاحقہ تو لگاتا ہے مگر کسی کو یاد نہیں رکھتا۔

اسلام آباد میں وہ طویل عرصے سے مقیم ہے۔ سی ڈی اے میں ساری عمر نوکری کرنے کے بعد اب ریٹائر ہو چکا ہے حیرت کی بات ہے کہ سی ڈی اے جیسے ادارے سے بھی وہ اس طرح پاک دامن باہر نکل آیا ہے کہ نچوڑنے پر فرشتے وضو کر سکتے ہیں۔ اس گل رنگ شہر کی ایک خوبصورت سڑک پر اس کی نفاست کا آئینہ دار اس کا گھر واقع ہے جسے اس نے ”افسانہ منزل“ کا خوبصورت اور رومانوی سانام دے رکھا ہے۔ اس کے گھر کے گیٹ سے لے کر ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، بیڈ روم اور سٹڈی روم تک ہر جگہ اس کا قہینہ اور اس کے اہل خانہ کا سلیقہ جھلکتا ہے۔ اس نے اپنے بیڈ روم کے بیرونی دروازے کی اندرونی سائیڈ پر لگی کھوئیوں پر بڑے اہتمام سے تین قسم کے لباس لٹا رکھے ہیں اور تینوں کے پنہ جانے کے مواقع مختلف ہیں۔ باہر جانے کیلئے کوٹ پتلون اور بندھی بندھائی ٹائی، گھر آنے والوں سے ملنے کیلئے شلوار قمیض سہولت کے مطابق گھر کے اندر رہنے کیلئے تہبند اور کرتا۔ اور صرف اپنی موجودگی میں.....

اس کے کمرے میں کتابوں، پنسلوں، وڈیو کیسٹوں، آڈیو کیسٹوں، وی سی آر، ڈیک کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سی چادر بھی ہے جس سے غلت کی صورت میں وہ ڈرائنگ روم کا کام لیتا ہے اس طرح چادر اور چار دیواری کا صحیح تر نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس نے کچھ وڈیو کیسٹس، شیٹ میں سجا کر رکھی ہیں جبکہ کچھ وڈیو کیسٹس شیٹ کے پیچھے چھپا کر رکھی ہیں۔ شیٹ میں جی کیسٹوں میں تو اس کے تحریر کردہ ٹی وی ڈرامے ہیں مگر شیٹ کے پیچھے چھپی ہوئی وڈیو کیسٹوں میں کیا ہے اس کا علم کسی کو نہیں۔

کچھ ٹی وی سیریلز کی شاندار کامیابی کے بعد اب منشیاد نے پرائیویٹ چینل کیلئے بھی ڈرامہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ چینل چونکہ کافی پرائیویٹ ہیں اس لئے اب اس کی پرائیویسی میں پی ٹی وی کا محل ہونا بھی کافی مشکل نظر آتا ہے۔

منشیاد کا نام سن کر شروع شروع میں تو ادبی دنیا سے نا آشنا کئی چلیے اور رومان

پسند نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن تیز ہوئی اور شریانوں میں دوڑنے والے گرم خون نے سرعت اختیار کر لی وجہ صرف اتنی سی تھی کہ منشا کے نام کا صوتی تاثر کچھ اتنا دلربا اور رومان پرور تھا کہ وہ تمام نوجوان اسے رمشا، نتاشا یا آشا جیسے ناموں کی حامل ایک نازک اندام خاتون سمجھ بیٹھے۔ ان سب نوجوانوں کی امنگوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب انہوں نے اس ”نازک اندام“ کو ٹی وی سکرین پر دیکھ لیا اور وہ دل چھوڑ کر سر تھام کے بیٹھ گئے۔

منشا یاد کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ ایک بہت محتاط شخص ہے۔ لفظ استعمال کرنے ہوں، لوگوں کو ملنا ہو یا کوئی رائے دینی ہو، ہمیشہ محتاط رہتا ہے۔ احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کیلئے کوئی افسانہ لکھنا ہو یا ڈرامے کا سکرپٹ تحریر کرنا ہو، وہ ہمیشہ کچی پنسل کا استعمال کرے گا تاکہ الفاظ کی تبدیلی کی صورت میں بھی دوسرے پر اس کی تکمیل پسندی کا تاثر زائل نہ ہو اور جا بے جا کٹ چھانٹ سے بھی صفحہ قرطاس پر اس کی نفاست اور خوش سلیقگی قائم رہے۔

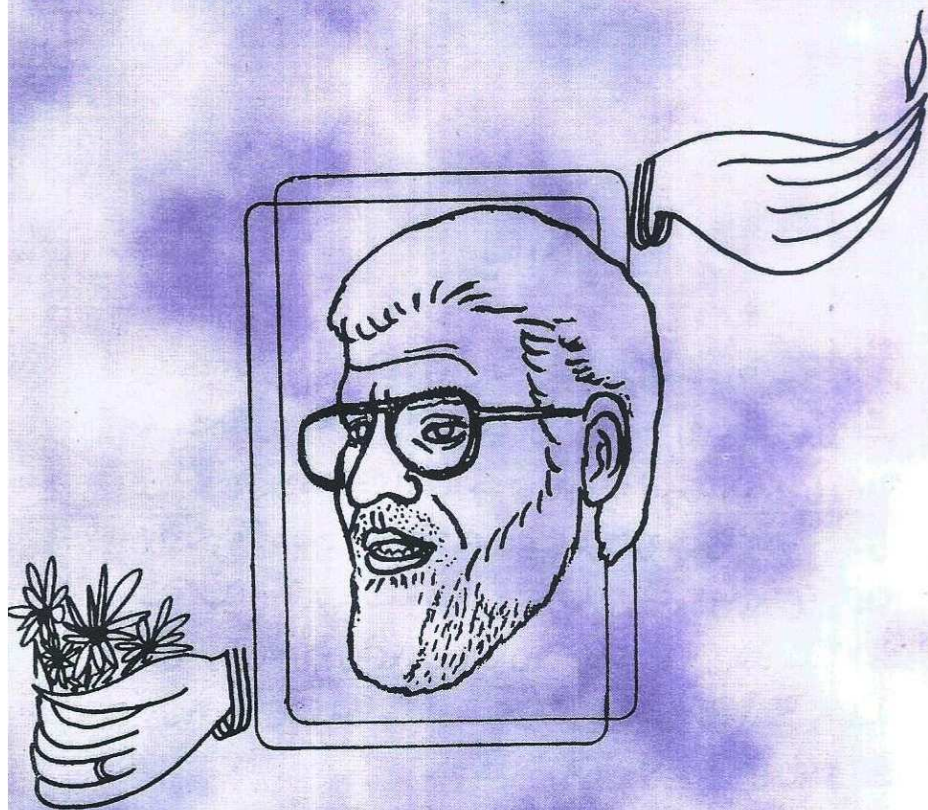
افسانے اور ڈرامے کی دنیا کا یہ معتبر نام بے حد منکسر المزاج شخص ہے اس کی خندہ پیشانی، اس کی بردباری اور اس کی مہمان نوازی اس سے ملنے والے ہر شخص کو متاثر کرتی ہیں۔ گھر آنے والے مہمانوں کی تواضع میں وہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دوستوں سے بہت محبت کرتا ہے کوئی دوست اس کے گھر جائے تو وہ نہایت وارفتگی سے اس کا استقبال کرتا ہے اور اسی وارفتگی سے اسے رخصت بھی کرتا ہے۔ نتیجتاً دوست غریب کو کچھ سمجھ نہیں آتی کہ وہ اس کے آنے پر زیادہ خوش ہوا ہے یا جانے پر۔

اردو اور پنجابی زبانوں پر یکساں قدرت رکھنے والا یہ فن کار بہت سے ایوارڈز بھی حاصل کر چکا ہے اگرچہ وہ ایک بڑا بلکہ بہت بڑا افسانہ نگار ہے لیکن قسمت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اسے زیادہ تر ایوارڈز ٹی وی ڈرامہ رائٹر کی حیثیت سے ملے ہیں۔ اگرچہ وہ ڈرامہ لکھنے میں بھی کمال رکھتا ہے مگر ٹی وی ڈرامہ بہر حال تخلیق کے اس درجے پر کبھی فائز نہیں ہو سکتا جو افسانے یا ناول کو حاصل ہے اور منشا یاد افسانہ نگار بھی خوب ہے اور ناول نگار بھی۔ لیکن ایک سچے تخلیق کار کو ایوارڈ سے زیادہ اپنے کام سے دلچسپی ہونی چاہیے اور یہ چیز منشا میں نظر بھی آتی ہے۔ بہر حال اسے ایوارڈز

ملیں یا نہ ملیں وہ مقبول ہو یا نہ ہو لیکن اس کے اندر کا پیارا سا مخلص اور سچا انسان جو بے حد حساس اور ہمدرد ہے کھرا اور خالص ہے ہمارے دل میں بتاتا ہے۔ وہ سچا سودا ہے اور اس کا کوئی مول نہیں۔ آپ اس گول مٹول، بیلو سے شخص سے مل کر تو دیکھیے اس کے نرم و گرم ہاتھ کالس محسوس تو کیجئے اس کی باتوں کی شیرینی کا ذائقہ تو چکھئے آپ اسے دل کے قریب پائیں گے۔ اسے کبھی بھول نہیں پائیں گے اور حسبِ منشا یاد رکھیں گے۔



عروضا، یعقوب آسی



فیروز

عروضیا

یعقوب آسی سے پہلی بار ملتے ہی احساس ہوتا ہے کہ آپ کسی شاعر سے مل رہے ہیں۔ چہرے پر وہی مخصوص بیزاری، لہجے میں تھکن اور گفتگو میں اکتاہٹ۔ وہ شاعروں کی اسی لڑی میں پرویا ہوا دکھائی دیتا ہے جو دلی اجڑنے کے بعد بھی جڑ نہیں پائی۔ اسے جاننا مشکل ہے ہی نہیں۔ اسے نہ جاننا مشکل ضرور ہے۔ جو شخص شاعری، افسانہ، تحقیق، عروض اور دیگر اصنافِ سخن میں ٹھیک ٹھاک منہ مارتا ہو، ایک متحرک حلقے کا متحرک سیکریٹری ہو ہر ہفتے ادبی صفحوں پر اس کی رپورٹیں چھپتی ہوں آپ اس کو جانے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔ پھر اپنی شخصیت کے سارے خطوط تو اس نے دکانوں پر لٹکے زرخناموں کی طرح اپنے باہر آویزاں کر رکھے ہیں۔

وکانوں سے یاد آیا کہ موصوف نے ایک وکان بھی کھول رکھی ہے۔ وہ عقیقہ چونکہ غیر محرموں سے زیادہ میل ملاپ پسند نہیں کرتی اس لئے زیادہ تر پردے میں ہی رہتی ہے اور اپنا گھونگٹ صرف تب اٹھاتی ہے جب آسی کے گھر آئے ہوئے کسی مہمان کیلئے باسی بسکٹوں کے ڈبے یا گھر کیلئے ماچس کی ڈبیوں کی ضرورت پڑے۔ وکان کا نام ملٹی سٹور ہے۔ ظاہر ہے نام وکان کے متنوع مقاصد کی چغلی کھاتا ہے۔ یار لوگ اس وکان کی آڑ میں کسی اور طرح کے کاروبار کے بارے میں موشگافیاں کرتے

رہتے ہیں مگر میری معلومات کے مطابق دکان کے نہ چلنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ یہ بھی شاعر ہے اور شاعر اسی طرح ایک کامیاب بزنس مین نہیں بن سکتا جس طرح ایک کامیاب کاروباری شخص بازوق نہیں ہو سکتا۔

یعقوب آسی نے چہرے پر ملا نصرالدین جیسی داڑھی رکھ ڈالی ہے۔ داڑھی میں سفیدی ڈال کر وہ کچھ معتبر سا دکھائی دینے لگا ہے۔ لوگ اپنے سر کے بالوں اور آدھی داڑھی کو سیاہ رنگ کر کے جوان دکھائی دینے کی کوشش ناتمام کرتے ہیں اور آسی غالباً "اپنے انہی بالوں کو سفید رنگ کر کے بزرگ بننے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ بزرگی کا تعلق تو بہر حال عقل سے ہوتا ہے۔

آسی ایک خوبصورت آدمی ہے۔ ستواں ناک، چمکیلی آنکھیں، گوری رنگت، بالوں کی چاندی اور بدن کا چھریراپن اس کی خوبصورتی کی دلیل ہے۔ اس کا دل اور ذہن بھی اسی کی طرح خوبصورت ہے وہ دوسرے شخص کی خوبی کے اعتراف میں بجل سے کام نہیں لیتا۔ دوستوں کے فن پر مضامین لکھنا اس کا مشغلہ ہے۔

یعقوب آسی انجینئرنگ یونیورسٹی ٹیکسلا میں ایک انتظامی عہدے پر فائز ہے۔ دفتر کا کام بھی وہ اسی طرح کرتا ہے جس طرح یونیورسٹی چلتی ہے لہذا کام کی زیادتی کے باعث دفتر سے وہ ایک کمپیوٹر اٹھا کر گھر لے آیا ہے جس پر اس کے بچے "دفتری" گیمیں کھیلتے ہیں۔

آسی ادب کی طرف سنجیدگی سے مائل ہے۔ وہ جزوقتی ادیب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ادب کی جس صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے سرخرو ٹھہرا ہے۔ شاعری، افسانہ اور تحقیق کے میدان میں اس نے جھنڈے گاڑے ہیں۔ اس کے فن میں "تفکر" جھلکتا ہے اور تفکر میں فن ہویدا ہے۔ عروض پر اس کی کتاب "فعلات" اس کے نزدیک اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے نزدیک یہ کتاب کھانا پکانے کی عمدہ تراکیب جیسی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس کا اصل کارنامہ تو اس کے مضامین اور اس کی شاعری ہے۔ ان دونوں اصناف میں اس کی کتابیں یقیناً "حیروں کے دروا کر دیں گی۔ میں "فعلات" کے خلاف اس لیے بھی

ہوں کہ یہ ایک اخلاق باختہ کتاب ہے۔ تقطیع کے عمل کے دوران اس کتاب میں ایسی ایسی غیر شرعی و صوتی تفصیل بے حجابانہ بیان کی گئی ہیں کہ اس پر تو حدود آرڈیننس کا اطلاق ہوتا نظر آتا ہے (لہذا حلقہ تخلیق ادب اب اپنی خیر منائے) اور کسی ممکنہ مقدمے کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہے۔

یعقوب آسی کو قرآن پاک، علامہ اقبال اور خطاطی سے محبت ہے۔ اس نے اپنی خطاطی کے ”نادر“ فن پارے اپنے ڈرائنگ روم میں سجا رکھے ہیں۔ جن میں اس نے تختی لکھنے کے انداز میں پورے ڈال کر خامہ فرسائی کی ہے۔ اگرچہ یہ خطاطی رشید دہلوی اور خورشید ارقم کے فن سے اور خطاطی کے فنی اصولوں سے حیرت انگیز بعد رکھتی ہے لیکن اس کے مسلمان اور ”اہل حدیث دل“ ہونے کی دلیل ہے۔

اس کی شخصیت اور گفتگو میں عجیب سیل ڈھیلا پن ہے۔ اس کی گفتگو سے سردیوں کے موسم میں اونگھتی ہوئی دوپر کا احساس ہوتا ہے۔ شاید علم عروض کا اثر اس کے بات کرنے کے انداز پر بھی پڑا ہے لہذا وہ ایک مخصوص بحر میں بات کرتا ہے اور اس کا یہ گفتگو کا انداز اتنا ڈھیلا ہوتا ہے کہ سننے والے کو جمائیاں آنے لگتی ہیں۔

شلوار قمیض اس کا پسندیدہ لباس ہے۔ پتلون سے جہاں میرا جسمانی اختلاف ہے وہ اس سے نظریاتی سطح پر اختلاف رکھتا ہے۔ شلوار قمیض کے اوپر ہاف سویٹر پہننا بھی اسے بہت مرغوب ہے۔

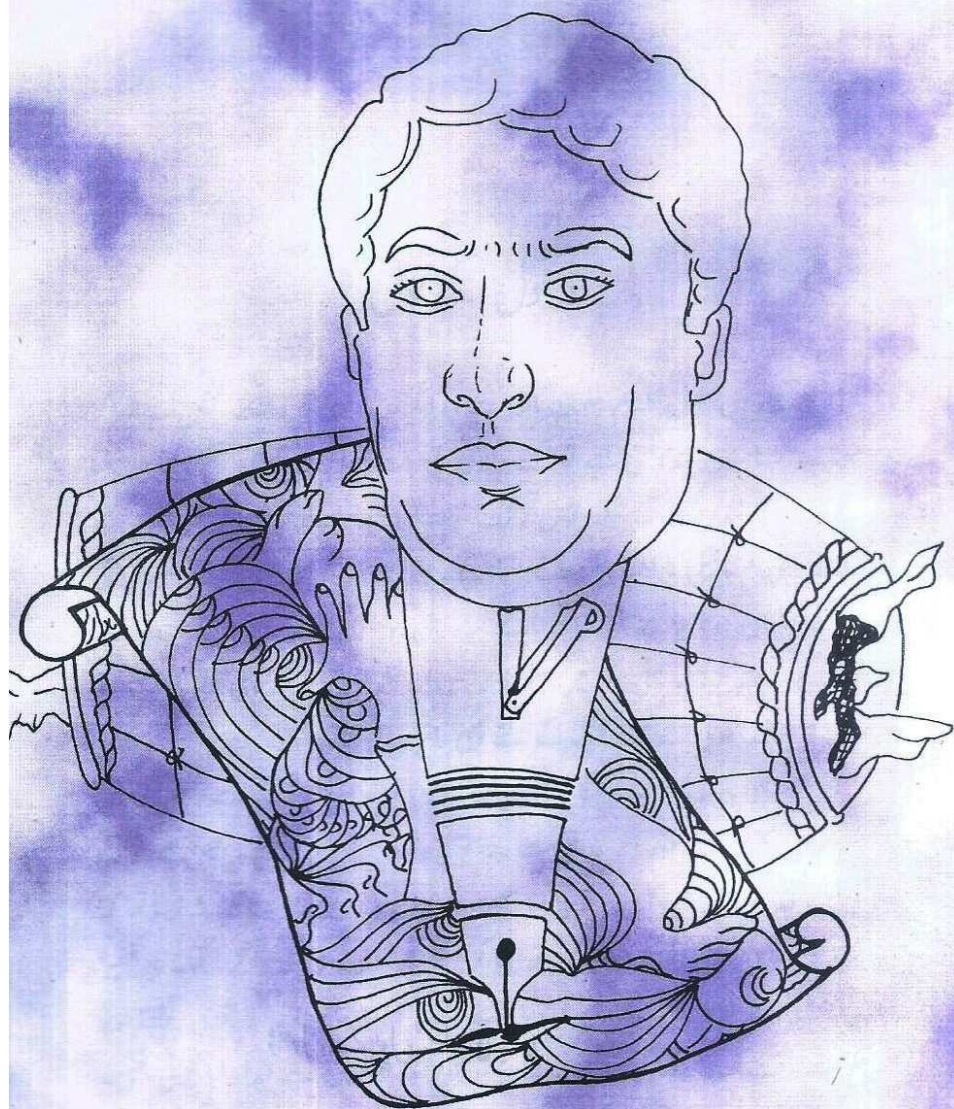
”کیا تنقیدی جملہ ہے“ غالباً اس کا تکیہ کلام ہے۔ کسی ادیب کا مضمون پڑھ رہا ہو، کوئی دوست گفتگو کر رہا ہو کسی کے بے ہنگم قہقہے جاری ہوں۔ یعقوب آسی ہمیشہ ایک ہی بات کہے گا ”واہ“ کیا تنقیدی جملہ ہے۔“ سنا ہے آسی ہماری بھابھی کی ڈانٹ پھنکار کو بھی ”کیا تنقیدی جملہ ہے“ کہہ کر سہارا جاتا ہے۔ شاعر پچارا اور کر بھی کیا سکتا ہے اور شاعر بھی ایسا جو سرتاپا آسی ہے۔ آس ہی آس۔ کہ شاید کسی دن سورج اس بام پر بھی چمکے۔ سنہرے دن پنکھ پھارے اس کے آنگن میں بھی اتریں اور مسرتوں کی کھکشانیں اس کے آسمان پر بھی نمودار ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ تب تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے نام کے دوسرے حصے کے پہلے حرف کو صحیح طریقے سے

نہیں لکھ گا اور ع سے عاصی لکھ کر اپنے تمام جلی و خفی گناہوں کا اقرار نہیں کرے گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ یعقوب کی قسمت میں آس کے دامن سے لپٹے رہنا ہی لکھا ہے لیکن وہ تو اپنی شخصیت کے حسن کے اعتبار سے یوسف ہے اور ماحول کے اعتبار سے یوسف بے کارواں۔ آج میں نے اس کے بے مثال حسن کی ایک جھلک اپنی انگلیاں کاٹ کر آپ کو دکھا دی ہے۔ اب انگلیاں کاٹنے کی باری آپ کی ہے۔



دھول کے پول، سلمان باسٹ



ڈھول کے پول

کہتے ہیں، جس کا نام سلمان باسط ہے وہ ایک بے حد تندرست شخص ہے۔ اگر موٹاپے کا نام ہی تندرستی ہے تو کئے والوں کی بات کو درست بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ اتنا تندرست ہے کہ قابل رشک صحت رکھنے والے لوگوں کو بھی اس کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بقول انور مسعود اس کا نام سلمان کی بجائے پہلوان ہونا چاہئے تھا۔ گھنگریالے سیاہ بال جو ابھی تک گھنے ہیں، چہرے سے سخت گیری مترشح ہے، پہلی نظر میں ہٹلر کا رشتہ دار نظر آتا ہے مگر پہلی نظر کی غلطی تو سب کو معاف ہوتی ہے لہذا آپ کے لئے بھی عام معافی ہے۔

سلمان باسط ہمیشہ سے اتنا ”صحت مند“ نہیں تھا۔ اگر یہ نعمت ہے تو سراسر ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اور اگر یہ قیامت ہے تو یہ وقت نے ڈھالی ہے۔ بچپن میں والدہ کی بے حد خواہش تھی کہ ان کا یہ بیٹا صحت مند ہو جائے کیونکہ خیر سے بڑا ایسا تھا کہ ہر دیکھنے والا اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر استغفار کا ورد ضرور کیا کرتا تھا۔ پیر فقیر بے یقینی کے ساتھ صحت مندی کی دعا دیتے تھے۔ قحط زدہ ممالک اپنا شہری سمجھتے اور حکومت وقت اسے دکھا کر خوراک کے بین الاقوامی اداروں سے امداد لیا کرتی تھی۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ والدہ کی دعا کچھ یوں قبول ہوئی کہ ادھر ایم اے کی ڈگری عطا ہوئی ادھر صحت نے اس کے بدن پر ڈیرے ڈال لیے۔ یار لوگ اس صحت کے بارے

میں بڑے مشکوک ہیں اور کسی ”اور قیامت“ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر اسے اس کی پرواہ نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں کہ اب تو وہ ہے اور صحت ہے، صحت ہے اور وہ ہے۔

سلمان نے بولنا پنجابی میں اور لکھنا اردو میں شروع کیا جبکہ ایم اے انگریزی میں کر ڈالا۔ شاید یہ صوبائی سطح سے قومی اور بتدریج بین الاقوامی سطح تک پہنچنے کی کوشش تھی لیکن انگریزی پڑھانے کے باوجود اردو میں لکھنا اور پنجابی بولتے چلے جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید انگریزی کی چکنی جلد پر سے اس کا ہاتھ پڑتے ہی پھسل جاتا ہے اور ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ بین الاقوامی سے قومی اور قومی سے صوبائی سطح تک آجانے کے بعد جانے وہ کس سطح پر جا کے ٹھہرتا ہے۔ ٹھہرتا بھی ہے کہ نہیں۔

انگریزی کا پروفیسر ہونے کے باوجود اردو اور پنجابی میں اس کی دلچسپی کئی لوگوں کے نزدیک خاصی حیران کن، کچھ کے نزدیک پریشان کن اور بیگم کے نزدیک خاصی قابل اعتراض ہے، بعض چلبے اسے زبانِ افرنگ کی بے برکتی کا نتیجہ بھی قرار دیتے ہیں، کچھ لوگوں کے نزدیک یہ ہوس زبان گیری ہے۔ جبکہ بیگم کے نزدیک محض گھر سے باہر رہ کر رات گئے تک ان دو دیسی زبان بولنے والوں کے ساتھ وقت کے بے دریغ ضیاع کا بہانہ ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن ایک بات طے ہے کہ اس کو ادھر ادھر مختلف زبانوں میں منہ مارنے کی ٹھیک ٹھاک عادت سی ہو چلی ہے۔

سلمان باسط ایک جذباتی آدمی ہے۔ بے حد جذباتی۔ گھڑی میں تولہ ہریل گولا۔ اس کے موڈ ادبی پرچوں کے معیار کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ اس جذباتی پن کے باعث اس کے شوق اپنی راہیں ہر روز تبدیل کرتے ہیں۔ ہر شوق جتنی شتابی سے شروع ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ عجلت میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بے ثباتی درحقیقت اس کے مزاج کا لازمی حصہ ہے۔ اس وجہ سے وہ کئی بار ملازمت چھوڑ چکا ہے تاہم ہر بار استاد کی حیثیت سے ہی مختلف کالجوں میں پڑھاتا رہا کہ اس کے علاوہ کوئی اور کام اسے آتا ہی نہیں ہے۔

مختلف جگہوں پر ملازمت سے یاد آیا کہ اسی سلسلے میں ایک دفعہ وہ یمن بھی جا چکا ہے۔ ازمنہ، وسطی کی نشانی اس ملک میں اس کی تعیناتی انگریزی زبان کے پروفیسر

کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن موصوف کا جی فقط چالیس دن میں اوب گیا۔ خود کو تسلی دینے، موضوع بدلنے اور لوگوں کا منہ بند کرنے کیلئے اس کی بس اتنی سی وجہ بتاتا ہے کہ جس کالج میں اس کی تعیناتی ہوئی تھی وہاں کے طالب علموں کو علم حاصل کرنے کی کچھ زیادہ جلدی نہیں تھی جبکہ وہ بہت جلدی میں تھا۔ لہذا اس کے بڑے سے جسم کے اندر چھوٹا سا دل ٹوٹ گیا، سامان باندھا، چار سالہ معاہدہ منسوخ کیا اور ایک بدوائے چلہ کاٹ کے واپس آگیا۔

وقت ضائع کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ یوں دھڑلے سے وقت ضائع کرتا ہے جس طرح بگڑے ہوئے امیر زادے نہایت بے دردی سے اپنے مرحوم باپ کی دولت اڑاتے ہیں۔ آج کا کام ہمیشہ ایسے کل پہ ٹالتا ہے جو کبھی نہیں آتا۔ اسی بہاؤ میں وہ گردش ایام کو بھی ٹالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن گردش ایام بھلا ایسی بلا کہاں جو ٹل جائے۔

شلوار قمیض اس کا پسندیدہ لباس ہے۔ بہت زیادہ تکلف کرنا مقصود ہو تو اوپر ویسٹ کوٹ بھی پہن لیتا ہے جس کے لئے بہت سا کپڑا ویسٹ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار سکارف یا مفکر کی مدد سے حسب توفیق فیشن بھی کر لیتا ہے۔ اس کے آگے نہ وہ جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے جانے کی گنجائش ہے۔ شلوار قمیض کا پہناوا غالباً اس کی ”فرہمانہ“ مجبوری ہے ایک زمانے میں وہ کوٹ پتلون اور فیشن کے دیگر اجزائے ترکیبی کے استعمال میں خاصا ڈھیٹ تھا مگر پھر اس کے ”PARABOLA“ بنے ہوئے پیٹ نے اس کی پیٹ اترا دی اب بھلا ہو کھلے ڈلے پاکستانی لباس کا کہ ستر بھی ڈھانپ رہا ہے۔ اور پاکستانی بنو، پاکستانی لباس پہنو کا پرچار فخر سے کرنے کا موقع بھی فراہم کر رہا ہے۔

ہڈ حرامی اس کی سرشت میں شامل ہے۔ گھر سے متعلق کام سے اس کی جان جاتی ہے۔ کسی کمرے کے پردوں کی رینگ خراب ہو یا کپڑے ڈرائی کلین کروانے ہوں، سبزی گوشت لانا ہو، کوئی ٹوٹی چیز مرمت کروانی ہو حتیٰ کہ کال بیل بجنے پر دروازہ کھولنا ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے آسرے ڈھونڈتا ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے بیگم کی ”گڈ بکس“ میں وہ کبھی نہیں آ سکا لہذا اپنے ہر شاعر ادیب بھائی کی طرح وہ بھی بیگم کی نظر

میں ایک ٹھٹھو اور غیر ذمہ دار شوہر ہے جسے سوائے ادب کے کوئی کام نہیں آتا۔ ادب بھی وہ جو بیگم کے کام کا نہیں۔ اس کے نزدیک اس سے تو وہ بے ادب ہی بھلا تھا۔

سلمان باسط کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے۔ اس کے دوست بہت ہیں بس ذرا دشمنی میں اس کا ہاتھ تنگ ہے۔ اسے کسی کو دوست بنانے میں دیر لگتی ہے نہ کسی کو اس کا دوست بننے میں۔ دیر صرف وہاں لگتی ہے جہاں اس کا مزاج کسی سے نہ ملتا ہو۔ اسے زعم ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک دوست دار آدمی ہے۔ اپنے دوستوں میں مستنصر حسین تارڑ سے لے کر دو میراثی تک سب کو شمار کرتا ہے۔ دوستوں میں بیٹھ کر اور خوش گپیوں میں وقت گزار کر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ خوش گپیوں کے علاوہ بھی اس نے اپنی جان کیلئے بہت سے روگ پال رکھے ہیں۔ ایم اے انگریزی کی کلاس لینا ایک مدت سے اس کی عادت ہے، ”صریر خامہ“ کے اجلاس میں شریک ہونا اس کے لئے لازمی ہے، پیشہ ورانہ فرائض کی بجا آوری اس کی مجبوری ہے، کسی نہ کسی کاروبار کی ناکام گھر پیسہ کوشش کئے چلے جانا اسے مرغوب ہے، دوستوں کے ساتھ باہر کھانا کھانا اسے محبوب ہے، رات کو دیر سے گھر آنا اور بیگم کے سامنے شرمندگی سے کوئی بہانہ بنانا اس کا اسلوب ہے، یہ سب بہت خوب ہے مگر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال خاصی گرم مرطوب ہے اور ہمیشہ سے ہے۔ یار دوست اس کے گھر دیر سے جانے کے بعد رونما ہونے والے حالات کے بارے میں اپنی اپنی خواہش کے مطابق موشگافیاں کرتے رہتے ہیں لیکن اس کی بیگم کے صلح جو رویے کے باعث ان سب کے تمام خواہش نما اندازے غلط ثابت ہوتے آئے ہیں۔

درحقیقت سلمان ایک خوش قسمت آدمی ہے۔ ساری زندگی اس کے لئے کام بھی سیدھے پڑتے رہے۔ سیدھا کوئی کام چونکہ تھا ہی نہیں لہذا اس کے لٹاپڑنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس نے بارہا ملازمت چھوڑی لیکن خوش قسمتی ہر دفعہ ایک نئی ملازمت اس کی جھولی میں ڈالتی رہی۔ محبت کے معاملے میں بھی وہ خاصا خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ والدین کی محبت، بھائی کی محبت، بیوی کی محبت، بچوں کی محبت، دوستوں کی محبت، اساتذہ کی محبت، شاگردوں کی محبت اور وہ محبت بھی جس کے ذکر سے نقص امن کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب محبتیں اس کے حصے میں آئیں اور خوب خوب

آئیں کہ وہ نہال ہو گیا ہے اگرچہ ڈیل ڈول سے ابھی تک نہال لگتا ہے۔

کھیل تماشہ اسے بے حد پسند ہے۔ سڑک پر ہونے والی لڑائی اور ٹی وی پر کرکٹ ہاکی اور فٹ بال کے میچ دیکھنا اسے بہت پسند ہے۔ فٹ بال کا ورلڈ کپ وہ بڑے شوق سے دیکھتا ہے۔ عین گول کے سامنے گیند آنے پر ٹی وی سکرین کے سامنے بیٹھے ہوئے اس کے پاؤں بے ساختہ ”ٹھٹھ“ نماک مارنے لگ جاتے ہیں۔ اصل میں بچپن میں وہ کھیلوں کا اتنا رسیا تھا کہ اس کا زیادہ تر وقت سکول گراؤنڈ میں ہی گزرتا تھا۔ اپنی کلاس کا کھیل کے لئے مختص پیرید ختم ہونے کے بعد بھی وہ گراؤنڈ میں ہی رہتا اور نئی کلاس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتا۔ پھر اس کے بعد نئی کلاس آ جاتی یوں یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک پی ٹی ماسٹر اسے کان سے پکڑ کر کلاس میں چھوڑ کر نہ آتے۔ پی ٹی سر کی مصلحہ دار ”پھینٹی“ بھی اسے کھیلوں کی دنیا سے باہر نہ نکال سکی اور وہ سکول کالج کی سطح کے بعد بورڈ اور یونیورسٹی کی سطح تک مختلف کھیلوں اور اتھلیٹکس میں ٹانگ اڑاتا رہا۔ وائے افسوس کہ آج اس کا تن و توش اس حقیقت کی نفی کرتا نظر آتا ہے اور اب تو وہ فقط جاپان کا سومو پہلوان ہی دکھائی دیتا ہے۔

پیدل چلنا اس بھلے آدمی کے نزدیک ایک مکروہ فعل ہے اگر کبھی اسے کچھ دیر یا کچھ دور تک پیدل چلنا پڑ جائے تو اس کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس دوران فاصلے کو بلند آواز میں اور اپنے ساتھ چلنے والوں کو دل ہی دل میں مسلسل کوسنا اس کی عادت ہے۔ اپنی فریبی کے باعث ملنے والے کوسنوں پر وہ کبھی دھیان نہیں دیتا۔ اگر کبھی اسے مجبوراً ان نصیحت نما کوسنوں پر دھیان دینا ہی پڑ جائے تو وہ ایسی معصومیت سے دوسرے شخص کی بات سنتا ہے جیسے اس سے قبل اسے اپنے زیادہ وزن اور اسے کم کرنے کے طریقوں کے بارے میں علم ہی نہ تھا۔ جب کبھی وہ کسی دوسرے فریبہ شخص کو کسی ذاتی کوشش کے نتیجے میں وزن کم کرنے میں کامیاب دیکھتا ہے تو جذباتی ہو جاتا ہے، فوراً وزن کم کرنے اور خوراک گھٹانے کا تہیہ کر لیتا ہے اور اس وقت تک تہیہ کئے رکھتا ہے جب تک سامنے دسترخوان نہیں بچھتا۔ جو نئی دسترخوان بچھا ہے وہ اپنا تہیہ تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیتا ہے اور انتقاماً ”کچھ دنوں میں اپنا وزن، خوراک اور زمین پر پڑنے والے اپنے سائے کو مزید بڑھا لیتا ہے اور یہ عمل اتنی تیزی سے ہوتا

ہے کہ درزی سے کپڑے سل کر گھر پہنچنے تک اس کو تنگ ہو چکے ہوتے ہیں۔
 کھایا جانے والا ہر لقمہ اسے یوں لگتا ہے جیسے غریب کی بددعا لگا کرتی ہے۔ اس
 کے موٹاپے میں ہمہ وقت کاریا موٹر سائیکل کے استعمال کا بھی خاصا اہم اور مرکزی
 کردار ہے۔ کار کا تو خدا بھلا کرے کہ مقدور بھر اس کی ستر پوشی کر لیتی ہے مگر موٹر
 سائیکل پر تو وہ پورے کا پورا نظر آتا ہے۔ ہنڈا سی ڈی ۵۰ بنانے والی کمپنی کو داد دینا
 پڑتی ہے کہ اس نے ایسی غیر معمولی موٹر سائیکل تیار کی ہے جو طوعاً "کرہاً" اسے
 اٹھائے پھرتی ہے۔ مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے زیر استعمال مظلوم اور
 بیچاری موٹر سائیکل کو روز حشر جب زبان ملے گی تو اس پر ٹوٹنے والی قیامت کا علم تب
 دوسروں کو ہوگا۔

یہ بات باعث حیرت ہے کہ پیدل چلنے سے نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ سیر و
 سیاحت کا بے حد شوقین ہے۔ اندرون و بیرون ملک وہ گھومنے کے لئے جاتا رہتا ہے
 نئی جگہیں، نئے لوگ اور نئے مناظر دیکھنا اسے بہت پسند ہے۔ اس کا یہی شوق اسے
 کچھ عرصہ پہلے ازبکستان کے افسانوی شہروں تاشقند، سمرقند اور بخارا لے گیا۔ وہاں وہ
 نئی جگہوں کو کم، نئے مناظر کو اس سے بھی کم تاہم نئے لوگوں کو بہت زیادہ دیکھتا رہا۔
 ویسے اس کا قصور اس لئے بھی نہیں تھا کہ وہاں کے لوگ "واقعاً" دیکھے جانے کے
 لائق تھے۔ اس کی جمالیات پسند طبیعت کو اپنے خطوں کے لوگ یوں بھی بہت بھاتے
 ہیں۔ ازبکستان میں ایمان شکن مناظر دیکھنے کے بعد لازم تھا کہ وہ ایمان کی سلامتی کے
 لئے بھی کوئی قدم اٹھاتا۔ لہذا حال ہی میں وہ عمرہ کر کے آیا ہے یاں لوگوں کا خیال ہے
 کہ نو سو چوہے پورے ہونے میں کوئی دو ڈھائی سو کی کسر رہ گئی تھی ورنہ وہ حج کرنے
 بھی جا سکتا تھا۔ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے ورنہ اس کے حلقہ احباب میں ایسے لوگ
 بھی شامل ہیں جنہیں ہر دم اپنے گناہ ضائع ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور جو پورے
 تقویٰ کے ساتھ راہ گناہ پر چلتے ہیں۔ ویسے سلمان باسط اپنی تمام تر روشن خیالی کے
 باوجود اندر سے کٹر مذہبی ہے۔ مذہب سے اور مذہبی لوگوں سے اس کی محبت ہمیشہ
 دوسروں کو نظر آ جاتی ہے اور وہ خواہش کے برعکس اپنے ناقدین کی نظر میں بورژوا او
 قدامت پرست ہی ٹھہرتا ہے۔

سلمان کو ماضی سے پیار ہے۔ پرانی یادوں کو وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے بھیگے گوشوں میں لاتعداد کھٹی میٹھی یادیں جگمگاتی رہتی ہیں۔ پرانے دوستوں کو، پرانی محبتوں کو، پرانی جگہوں کو، پرانے سکولوں کالجوں کو، پرانے راستوں اور گلیوں کو، پرانے گھروں کو، پرانے دروازوں کھڑکیوں اور طاقتوں کو وہ کبھی نہیں بھول پاتا اور وہاں تنہائی کے لمحات میں یادوں کے چراغ روشن کرتا رہتا ہے۔

یہ تو آپ جان ہی چکے ہیں کہ وہ کوئی نہ کوئی کاروبار کرنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے لیکن کاروبار میں اس کی دلچسپی بذات خود ایک دلچسپ معاملہ ہے۔ درحقیقت ہر ملازم پیشہ آدمی کی طرح اپنے مالی حالات پر کڑھنے کا اسے بھی شوق ہے وہ چونکہ کچھ زیادہ ہی کڑھتا ہے لہذا اکثر کسی نہ کسی کاروبار میں ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کرتا رہتا ہے۔ آغاز میں تو وہ بے حد جذباتی ہوتا ہے اور ممکنہ کاروبار کی متوقع کامیابی کے حق میں بہت سی خوشنما دلیلیں دیتا ہے مگر بعض کاروبار نیت سے قبل ہی حالت رکوع میں چلے جاتے ہیں جبکہ بعض رکن قیام سے بھی قبل سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ وجہ صرف اس کی ذہنیت ہے جو کبھی کاروباری نہیں بن سکتی۔ پھر اس کی آرام پسند طبیعت کاروبار کی سخت کوشی کی متحمل تو ہو ہی نہیں سکتی لہذا ہر بار وہ کاروبار میں اپنی نااہلی کا نتیجہ اخذ کر کے آئندہ کے لئے توبہ کر لیتا ہے مگر پھر آمد بہار کے ساتھ ہی وہ گریبان چاک کر کے کسی نئے کاروبار کے جنگل میں جا نکلتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کے کاروبار پر ہمیشہ کی طرح چند روز میں ہی خزاں آجاتی ہے۔ یوں پھر اسے سرگرمیاں ہی پھرنا پڑتا ہے۔

سلمان باسط کو ایک کام بہت اچھی طرح آتا ہے اور وہ ہے باتیں بنانا۔ اس فن میں کافی مہارت رکھتا ہے اور کئی کئی گھنٹوں تک کسی بھی موضوع پر بے تکان بول سکتا ہے۔ اگرچہ وہ سائنس اور اس جیسے دیگر علوم کی ابجد سے بھی واقف نہیں لیکن وہ ان تمام موضوعات پر اتنی مشاقی سے گفتگو کرتا ہے کہ متعلقہ مضمون میں پی ایچ ڈی کے حامل افراد بھی اس کی نئی نئی تھیوریوں کو توجہ سے سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور نہایت سنجیدگی سے اس کی ”پرمغز“ دلیلوں کو اس کے اپنے وزن کی طرح باوزن سمجھنے لگتے ہیں۔ اس تمام صورتحال میں وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے اور اندر ہی اندر

دوسروں کی کیفیت سے لطف اٹھاتا ہے۔ اس کی گفتگو کی عادت نے اسے بحث کرنے کا عادی مجرم بنا ڈالا ہے۔ دلیل کی قوت سے بہرہ ور ہونے کے باعث وہ عموماً "بحث میں جیت بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ درست کہہ رہا ہو بس وہ بولتا ہے تو خود کو مکمل طور پر درست سمجھتا ہے چاہے اندر سے خود اسے درست نہ بھی سمجھتا ہو تو بھی ایک دفعہ ایک موقف اختیار کر لینے کے بعد اس پر ڈٹ جاتا ہے اور پھولے ہوئے پیٹ کے اوپر سینہ تان لیتا ہے کہ اپنے موقف سے دستبرداری کو وہ شکست کے مترادف سمجھتا ہے اور پسپائی اسے کسی بھی صورت پسند نہیں۔ نیولین بونا پارٹ کی طرح وہ کامیابی حاصل کرنا (چاہے بحث میں ہی کیوں نہ ہو) ضروری سمجھتا ہے۔ بس ذرا اپنے والد صاحب کے ساتھ اگر کسی مسئلے پر اس کی بحث ہو جائے تو وہ مقام اس کے لئے یوں واٹر لو ثابت ہوتا ہے کہ مقابل صرف سماعت اور دلیل ہی نہیں ہوتی ڈانٹ بھی ہوتی ہے۔

سلمان عمدہ کھانے کا شوقین ہے۔ اچھا کھانا اور پھر دوستوں کی معیت میں کھانا اس کو بہت پسند ہے۔ اس کے بھاری بھر کم جسم سے لگتا ہے کہ وہ بہت زیادہ کھاتا ہوگا لیکن اندر کی بات یہ ہے کہ وہ اتنی ہی خوراک کھاتا ہے جتنی کوئی بھی نارمل اور صحت مند آدمی کھا سکتا ہے۔ بس جو چیزیں اسے مرغوب ہیں وہ خود بخود بذریعہ دہن اندر پھسلتی رہتی ہیں اور اس کے موٹاپے میں اضافے کا موجب بنتی رہتی ہیں۔ البتہ اس کے بیوی بچوں کا دبلا پن دیکھ کر ان کے قدیم مشرقی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ پرانے وقتوں کی میسیاں پہلے اپنے مردوں کے سامنے سارا رکھ دیتی تھیں۔ یوں گمان گزرتا ہے کہ وہ پہلے خوب پیٹ بھر کر کھاتا ہوگا اور پھر اگر خدا نخواستہ کچھ بچ جاتا ہوگا تو باقی کنبے کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتا ہوگا۔

سلمان باسط کی شخصیت خاصی متنوع ہے وہ بیک وقت شاعری، افسانہ، خاکہ نگاری، کالم نگاری، ڈرامہ نگاری، تدریس، کمپیئرنگ اور تنقید نگاری میں منہ مارتا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ صرف "Jack of all trades" ہی بن سکا ہے تاہم کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ وہ ایسا Jackscrew ہے جو بہت سا وزن اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر اس کا اپنا خیال ہے کہ شاید مکمل طور پر اسے کچھ بھی نہیں آتا۔ زمانہ طالب علمی،

میں ہی وہ شاعری کی کتاب ”جھیل میں کنکر“ کے نام سے لے آیا تھا۔ روز نامہ جنگ کیلئے تمباکو نوشی کے خاتمے کے لئے ایک کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے چھپواتا رہا۔ انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کے لئے انگلش گرامر کی ایک کتاب مرتب کر ڈالی۔ ”خاکی خاکے“ اس کی تازہ ترین شرارت ہے۔ لیکن یہ مورکھ اس کتاب میں سربازار دوسروں کے گندے کپڑے دھوتے دھوتے اپنے میلے کپڑے بھی رکھ کر بیٹھ گیا ہے۔ اب میل ہے کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اسے کم عقلی نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ اس نے اپنے ڈھول کا پول خود ہی کھولنا شروع کر دیا ہے۔ یہ اہتمام شاید شعوری ہے جیسے ایک سردار جی بازار میں تن پر فقط ایک انڈر ویئر اور ایک نکٹائی سجائے گھوم رہے تھے۔ ان کے ایک دوست نے مسکراتے ہوئے آواز لگائی

”سردار جی! خیر تو ہے آج بڑی ٹائیاں شانیاں لگا رکھی ہیں۔“

سردار جی نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا

”یار! آج کچھ مہمان آرہے ہیں۔“

دوست نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا

”لیکن سردار جی! آپ نے نیچے تو صرف کاچھا پہن رکھا ہے“

سردار جی نے برجستہ جواب دیا

”مہمانوں کا کیا اعتبار وہ آتے بھی ہیں یا نہیں“

تو صاحبانِ فہم و ادراک! اس ”مردِ زیرک“ نے اگر دیگر خاکوں کے ساتھ اپنا

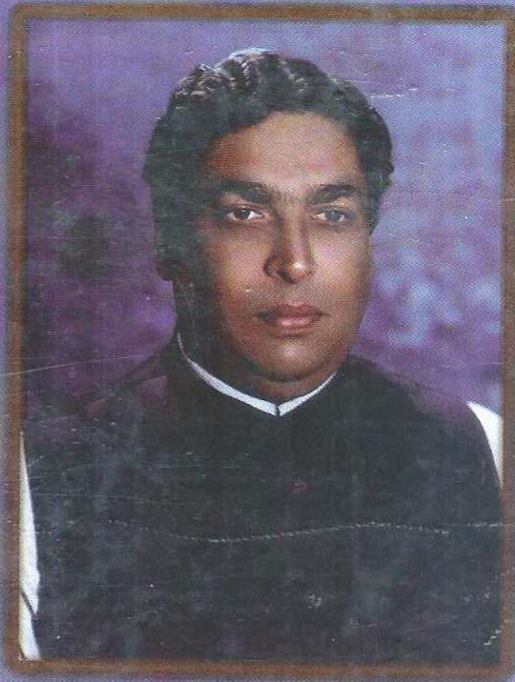
خاکہ بھی اڑا ہی لیا ہے اور ٹائی کے نیچے انڈروئیر یا انڈوئیر کے اوپر ٹائی پہن ہی لی ہے تو اسے کم از کم اس اہتمام کی داد تو دیجئے۔

تعارفہ

نام:	سلمان باسط
پیدائش	25 نومبر 1958ء لاہور
تعلیم	ایم۔ اے انگریزی، گورنمنٹ کالج لاہور، 1982ء
حالیہ ملازمت	صدر شعبہ انگریزی
رابطہ	فیڈرل گورنمنٹ ڈگری کالج برائے طلباء، واہ کینٹ 26-D/2 گدوال، واہ کینٹ فون دفتر 0596-3471 گھر 0596-531788

تصنیفات

1	جھیل میں کنکر	(شاعری)	1981
2	خاکی خاکے	(معاصر ادیبوں کے شخصی خاکے)	1998
3	اک یاد کا پھول نکھرتا ہے	(شاعری)	زیر طبع
4	صلائے عام	(کالم)	زیر طبع



سلمان باسط کے لئے

حضور حق لب انور ہوا دعا پرداز
کہ اس کے خامہ خاکہ رقم کی عمر دراز
یہی تو رکھتا ہے سلمان منفرد انداز
شگفتگی و مرقع نگاری و ایجاز
انور مسعود

